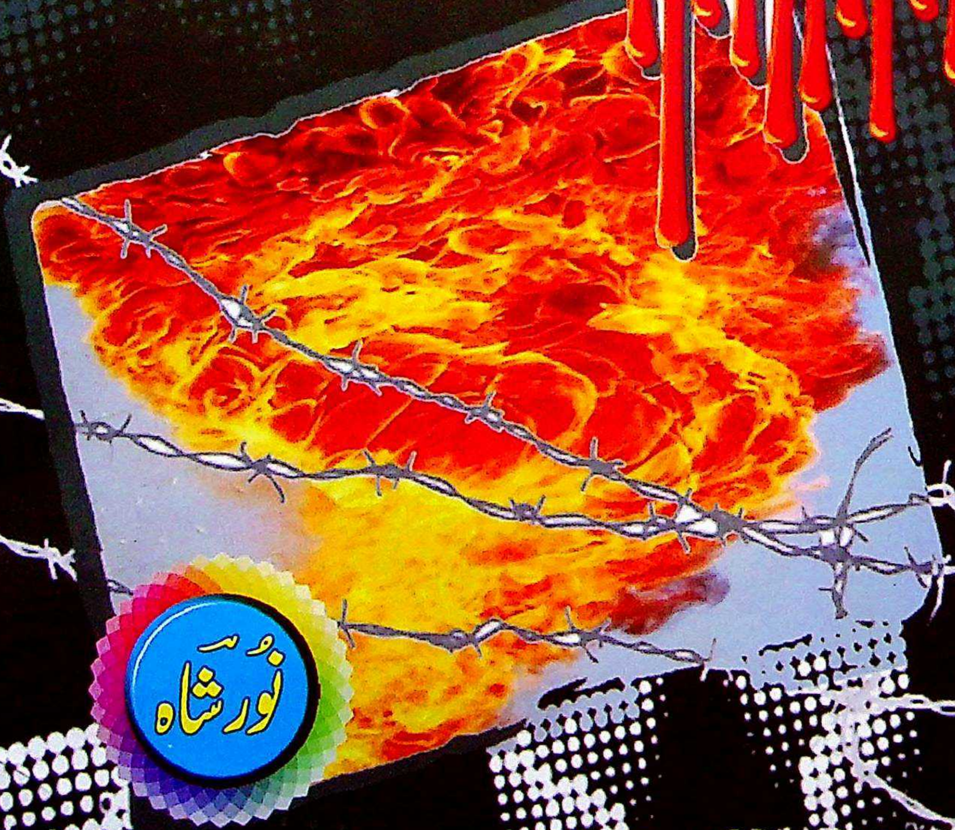
کشمیر کہانی

افسانے/ڈرامے



نور شاہ

آئے گا فلک پر وہ ستارا واپس
یہ چیز ہے کیا آئے گا سارا واپس
افسوس اس اک بات کا ہے دنیا میں
آنا نہ مجھی کو ہے دوبارا واپس

انتساب

ڈاکٹر فرید پربتی (مرحوم) کے نام

بس کہ اپنوں ہی کے ہاتھوں سے ہوا ہے میرا قتل
لوگ کہتے ہیں کہ ''تیرا خون بہا'' کچھ بھی نہیں.....!!

نور شاہ کی دوسری تخلیقات

☆	بے گھاٹ کی ناؤ	افسانے
☆	نیلی جھیل کالے سائے	ناول
☆	ویرانے کے پھول	افسانے
☆	من کا آنگن اُداس اُداس	افسانے
☆	پائل کی زنجیر	ناول
☆	آؤ سو جائیں	ناولٹ
☆	انتخاب اُردو ادب	(ریاست جموں وکشمیر۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۷۱ تک، ایک جائزہ)
☆	ایک رات کی ملکہ	افسانے
☆	آدھی رات کا سورج	ناولٹ
☆	لمحے اور زنجیریں	ناولٹ
☆	گیلے پتھروں کی مہک	افسانے
☆	بے ثمر سچ	افسانے
☆	بند کمرے کی کھڑکی	ڈائری کے اوراق پر مشتمل رفتہ رفتہ یادیں
☆	کہاں گئے یہ لوگ	ادبی خاکے
☆	آسمان پھول اور لہو	افسانے
☆	جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار	تعارف، فن اور مکالمہ
☆	نور شاہ کے تین ناولٹ	مرتب: روف راحت

نورشاہ کی تخلیقات پر ایم۔فل۔کی ڈگریاں

☆ گیلے پتھروں کے مہک۔۔ایک تنقیدی جائزہ۔ امتیاز احمد (۲۰۰۱ء) زیرنگرانی
پروفیسر شہاب عنایت ملک (جموں یونیورسٹی)

☆ بے ثمر سچ۔۔۔ایک تنقیدی جائزہ۔۔ سدیش کمار (۲۰۰۸ء) زیرنگرانی
پرفیسر ضیاالدین (جموں یونیورسٹی)

☆ نورشاہ کے تین ناولٹ (رات کا سورج، آؤ سو جائیں اور لمحے اور زنجیریں) کا تنقیدی جائزہ نظارت حسین (۲۰۱۱ء) زیرنگرانی
پروفیسر محمد ریاض احمد
(جموں یونیورسٹی)

☆ آسمان پھول اور لہو۔۔۔ایک تنقیدی جائزہ سمیرا احمد دیوا (۲۰۱۲ء) زیرنگرانی
ڈاکٹر مسرت جہاں
(مولانا آزاد اُردو یونیورسٹی حیدرآباد)

ایک کامیاب افسانہ نگار کسی وضاحت، تکلم اور خیال آرائی سے کام نہیں لیتا، یہ کام وہ قاری کے لئے چھوڑ دیتا ہے، نورشاہ کے افسانے بھی کسی آغاز، اختتام، انٹی کلائمکس، خیال آرائی یا وضاحت کے محتاج نہیں ہوتے یہ افسانوی تکنیک میں ایک خوش آئند تبدیلی ہے۔!

پروفیسر حامدی کاشمیری

کشمیر کہانی

افسانے............ڈرامے

ترتیب

افسانے

ڈرامے

تاثرات

اپنی بات

کشمیر کہانی کے گُم شدہ کردارو

آؤ

اور میرے وجود کے دلدل میں سماجاؤ

بھول جاؤ کہ یہ دلدل ہے

باہر بھی تو؟!

بارود کا دُھواں ہے

گولیوں کی گھن گرج ہے

چیخنے اور رونے کی آوازیں ہیں

گھروں اور گھر والوں میں مایوسی ہے

درودیواروں پر وحشت ہے

خوف وڈر ہے

آگ ہے اور آگ کے شعلے ہیں

سڑک پر بکھری خونی لکیریں ہیں

بے نام قبروں پر بچھے خشک زرد پتوں کی تہیں ہیں

اب تو

امید کی روشنی پگھل پگھل کر بجھ چکی ہے

لیکن ٹھہرو!

میری بات سنو؟

کب تک دلدل کی اندھی عمارت میں

سِسک سِسک کر دم توڑو گے

آؤ باہر آؤ

سوچ کی اُڑان سے اُوپر اُٹھ کر

اپنے آس پاس کی سارے ڈھول

خوف وڈر اور ساری وحشت

میرے وجود کے دلدل میں اُتار کر

ایک نئی کہانی

کشمیر کہانی کو جنم دو.....!!!

نور شاہ

سرینگر۔ دسمبر ۲۰۱۲ء

پیش لفظ

؎ ملا تو ورثے میں بس اک قلم ملا ہے مجھے

کشمیر کے قارئین اُردو ادب کے ایک بہت بڑے حلقے کو اس بات کا گلہ اور سخت ملال رہا ہے کہ پچھلے لگ بھگ تیس برسوں سے، ریاست جموں وکشمیر خاص طور پر وادی میں تخلیق ہونے والے اُردو ادب (نثر و نظم) میں موجودہ دور کے نامساعد حالات کی بھرپور عکاسی نہیں ہو رہی ہے اتنا ہی نہیں بلکہ اس ضمن میں الزام تراشیاں بھی کہیں کہیں سننے میں آتی ہیں کہ ادیب وشاعر وظیفہ خوار ہو گئے ہیں۔

کہانی کار یا شاعر بھی عام لوگوں کی طرح ہی سماج کا ایک ذمہ دار فرد ہوتا ہے۔ اپنی نظموں، غزلوں، افسانوں اور کہانیوں کا تانا بانا وہ اپنے گردو پیش میں رونما ہونے والے واقعات سے ہی بُنتا ہے کسی آسمانی مخلوق کی روداد سے نہیں۔ عصر حاضر کے مسائل ومشکلات کا اُسے جتنا فہم وادراک ہوگا اور جتنا انہیں وہ اپنے تخلیق ہونے والے ادب میں کھپا سکے گا اتنا ہی وہ اپنے قارئین میں ہردلعزیز اور مقبول ہوگا اور ترقی پسند وجدید بھی۔

یہ بات اپنی جگہ پر بجا ہے کہ آج نہ کشمیری قلمکاروں میں اختر محی الدین مرحوم جیسے جرأت مند اور باحوصلہ کہانی کار موجود ہیں جنہوں نے مقبول بٹ کی پھانسی پر بطور احتجاج پدم شری واپس لوٹا دیا تھا۔ کہ آج کی تاریخ میں لاکھوں لوگوں کا قتل وخون بھی کسی کشمیری ادیب کو ٹس سے مس نہیں کر رہا ہے اور نہ ہی غلام ربانی تاباںؔ مرحوم جیسے اُردو شاعر موجود ہیں جنہوں نے میرٹھ کے مسلم کش فرقہ وارانہ فسادات پر پدم شری لوٹا دیا تھا کہ آج مسلمانوں کو نہ بابری مسجد کا انہدام اور نہ ہی گجرات کے مسلمانوں کا منصوبہ بند قتل عام ہی ایسا کرنے کی ہمت وحوصلہ پیدا کر دیتا ہے۔

لیکن یہ بات بھی ہے کہ آج بھی وادی سے تعلق رکھنے والا ایک چھوٹا سا اُردو کہانی کار مرحوم

عمر مجید، اپنا پہلا افسانوی مجموعہ اپنے ایک عام پڑوسی عبدالخالق کو منسوب کرتا ہے۔ جس عبدالخالق نے خون میں لت پت ہوکر عمر مجید کی گود میں نہ صرف دم توڑا بلکہ اس عظیم صدمے سے لگ بھگ دس سال تک 'اس عظیم انسان کی زندگی سے ہر خوشی اور مسرت' اس کے چہرے سے مسکراہٹ اور اس کے قلم سے لاتعداد کہانیاں چھینیں۔

مرحوم عبدالخالق' مرحوم عمر مجید کے رشتہ دار یا کوئی عزیز نہ تھے۔ وہ ایک کہانی کار کی کہانی کا کردار تھے۔ کہ جس نے افسانے کے کردار کو خون میں لت پت کردیا اس نے افسانہ نویس کے دل وجگر اور دماغ و ذہن کو بھی لہولہان کردیا۔ کوئی اس واقعے سے کیا مقصد نکالے' اس کی مرضی' ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ایک قلمکار، ایک رائٹر کی، عصر حاضر کے مسائل سے متاثر ہونے یا پھر ہر دُکھ درد میں اپنے گردوپیش کے لوگوں کے ساتھ کھڑا رہنے کی اور کیا مثال ہوسکتی ہے۔

ویسے بھی یہ ایک فطری عمل ہے کہ اگر سو رونے والوں میں ایک شخص ہنسنے لگے تو اس کی دماغی صحت کی جانچ ہونی چاہیئے۔ پچھلے سال صرف وادی کشمیر میں ہی لگ بھگ دوسو کے قریب اُردو کتابیں شائع ہوئی ہونگیں ان میں کہیں نہ کہیں پر کشمیر کا درد جابسا ہوگا اور ضرور ہوگا فرق بس اتنا ہے کہ کوئی اس صدمے سے لہولہان ہے، کوئی دم بخود اور کوما میں ہے کوئی رو رو کر چلا رہا ہے کسی کے خود بخود آنسو بہہ رہے ہیں۔ کسی کے آنسو خشک ہوچکے ہیں اور کوئی سینہ کوبی کررہا ہے۔ ماتم کا اظہار ہر کوئی کررہا ہے اور اپنے انداز سے کررہا ہے۔

نور شاہ جیسے صف اول کے معروف اُردو کہانی کار نے بھی ان تیس سالوں میں تخلیق ہونے والے اپنے افسانوی ادب میں اس کا جابجا اظہار کیا ہے۔

موجودہ نامساعد حالات میں جو تین دہائیوں کے وقفے پر تقریباً محیط ہے نور شاہ کی کہانیاں اس تعلق سے اُردو کے مختلف معیاری رسائل وجراید میں شائع ہوئیں ان سب کو ''کشمیر کہانی'' کے عنوان سے شائع کرانے کے خیال کا جب انہوں نے مجھ سے اظہار کیا تو میں نے فوراً اُس کی تائید کی الحمدللہ آج یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر آپ کو ضرور یہ احساس ہوگا کہ کشمیر کا قلمکار

خاص طور پر اُردو کہانی کار موجودہ حالات سے نہ آنکھ چرا رہا ہے اور نہ مصلحتاً ان کے اظہار سے اپنی ذمہ داریوں سے کسی لالچ، خوف یا پھر ذاتی اغراض و مقاصد کی وجہ سے پیچھے ہٹ رہا ہے یا پھر ان پر پردہ ڈال رہا ہے۔ بلکہ خود بھی انہیں جھیل رہا ہے ان حالات کے جو شکار ہوتے ہیں ان کا دکھ درد اپنے اندر محسوس کر رہا ہے اور انہیں صحیح پس منظر میں اپنے قارئین تک بھی پہنچا رہا ہے جو اس کا منصب ہے اس کی بھرپور حق ادائی ہو رہی ہے اور اسے ورثے میں قلم ملا ہے کوئی خنجر یا تلوار نہیں۔

ے ملا تو ورثے میں بس اک قلم ملا ہے مجھے

احقر

ڈاکٹر اشرف آثاری

۲۵، فروری ۲۰۱۲ء

افسانے

یہی سچ ہے!

میں جب بھی اپنے گھر کی کھڑکی سے اس کُھلے کُھلے سے وسیع قبرستان کی جانب دیکھتا ہوں تو مجھے اُن کچی پکی قبروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا جن پر لکھی ہوئی عبارتیں اب لفظ اور دائروں میں سمٹ کر رہ گئی ہیں یہ مٹتے ہوئے الفاظ جیسے کوئی کہانی دہرا رہے ہوں۔ میں اس کہانی کی تلاش میں اپنے گھر سے باہر آتا ہوں اور قبرستان کی جانب بڑھنے لگتا ہوں یہاں روشنی ہوتے ہوئے بھی اندھیرے ہیں، یہاں ہر جانب موت کے سائے منڈلاتے نظر آتے ہیں، روحیں سرگوشیاں کرتی ہیں اور ادھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہیں۔ میں ان روحوں کو دیکھ نہیں سکتا لیکن اپنے دل کی دھڑکنیں تو گن سکتا ہوں اپنے لبوں کی تھرتھراہٹ تو محسوس کر سکتا ہوں۔ یہ لڑکھڑاتے ہوئے پتے اور اُبھرتے ہوئے مٹی کے ڈھیر تاریخ کے اوارق کو الٹ پلٹ کر کے نہ جانے مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ دُھند اور اندھیرے گھٹتے بڑھتے سایوں کو جنم دے رہے ہیں اور اِن سایوں میں دفعتاً ایک قبر کا منہ کُھل جاتا ہے اور اس میں سے ایک شخص ایک نوجوان خوبرو شخص جس کا چہرہ دُھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید آنکھیں سُرخ اور ہونٹ ادھ کُھلے ہیں باہر آتا ہے اور میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں اپنی بے نور آنکھوں سے اُسے پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن سوچیں ساتھ نہیں دے رہی ہیں۔ اب میں اسے پہچان پایا ہوں، میں نے اس کی تصویر دیکھی ہے اخباروں میں پہلے بہت پہلے...... ارے یہ تو اپنا سلمان ہے۔ میرا محلے دار، میرا ہمسایہ... لیکن یہ یہاں اس قبرستان میں...... اس کے بارے میں تو سنتے تھے کہ پچھلے چار برسوں سے لاپتہ ہے، شہر سے باہر گیا ہے.... روٹی روزی کی تلاش میں، اپنی چھوٹی بہن کے اَن دیکھے خوابوں میں رنگ بھرنے کے لئے۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا ہے کانوں کی لویں سرخ ہو رہی ہیں لیکن ہاتھ سرد اور قدم منجمد میں اپنی جگہ سے ہل نہیں رہا ہوں، ہل ہی نہیں سکتا اس حالت میں مجھے کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا پر میں سب

کچھ دیکھ سکتا ہوں..... یہ کیا ایک اور قبر سے مٹی ملنے لگی ہے۔ قبر کا سینہ چاک ہو رہا ہے' اپنی دبی دبی سسکیوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے میرے سامنے یہ کون کھڑا ہو گیا ہے' میری جانب دیکھنے کی بجائے وہ سلمان کی طرف دیکھے جا رہا ہے' شاید یہ دونوں دوست رہے ہوں گے۔ غم گسار رہے ہوں گے' دونوں کے وجود ایک دوسرے کے لئے ناگریز رہے ہوں گے۔ زندگی کے حسن اور بدصورتی کو دونوں نے ساتھ ساتھ محسوس کیا ہوگا۔ میں اب اسے بھی پہچان رہا ہوں یہ اکرم ہے' اکرم چھ برس قبل اس بستی سے ایسے غائب ہوا تھا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو۔ میرا دل دھڑک رہا ہے' ہونٹ کانپ رہے ہیں' میں تو لفظوں کو دائروں میں سمٹنے کی کہانی کی تلاش میں یہاں آیا تھا لیکن یہاں تو ان گنت کہانیاں بکھری پڑی ہیں اپنی قبروں کی آغوش میں دبی ہوئی ہیں۔ اور یہ قبریں لاتعداد ہیں۔ سفید براق کفن اُڑھے قبر کی خاموشیوں سے اُبھر کر یہ لڑکی مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے۔ ''اجنبی تم مجھے پہچانتے ہو' میں حلیمہ ہوں..... ماں کے ساتھ اپنے رشتہ داروں کے ہاں دعوت پر جا رہی تھی بس سٹینڈ پر جانے کیا ہوا.... کس نے گرینڈ پھینکا کس نے گولیاں داغ دیں... ہم ماں بیٹی خون میں لت پت ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں... بہت محبت کرتی تھی میں اپنی ماں سے.... جانے میرا چھوٹا بھائی کہاں ہے.... کیسے ہے.... تم جانتے ہو اُسے' تم نے اُسے دیکھا ہے۔ کیا وہ سکول جاتا ہے.... کیا کوئی اُسے پیار کرتا ہے....'' وہ اب روتی جا رہی ہے' سفید کفن اس کے آنسوؤں سے تر ہوتا جا رہا ہے اور مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ یہ کیا.... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، دور سے کچھ لوگ ہاتھوں میں مشعلیں لئے قبرستان کی جانب بڑھ رہے ہیں' شاید اُن لوگوں کی تلاش میں جو کل تک اُن کے ساتھ تھے اُن کے اپنے تھے اُن کے وجود کا حصہ تھے لیکن آج ان قبروں میں لفظوں کی طرح سمٹ سمٹ کر دائرے بن گئے ہیں۔ یہ لوگ ابھی ذرا سی دوری پر ہیں لیکن میں اُن کی چہروں کو دیکھ سکتا ہوں اُن کی آنکھوں میں تلاش کی پرچھائیاں محسوس کر سکتا ہوں۔ اُن کے لرزتے' لڑکھڑاتے قدموں کی آہٹیں سُن سکتا ہوں۔ وہ ان قبروں پر جُھک جُھک کر جانے ان سمٹے ہوئے دائریوں میں کس کے اور کون سے نام تلاش کر رہے ہے۔ لیکن یہ..... یہ زوردار آواز... یہ زوردار جھٹکا، زبردست کھلبلی مچ گئی ہے۔

ان لوگوں میں.... بھاگم بھاگ.... دیکھ رہا ہوں' پیڑوں پر جلتی ہوئی شاخیں ٹوٹ کر زمین پر بکھر رہی ہیں بالکل ایسے ہی جیسے ہاتھوں میں مشعلیں لئے یہ لوگ گولیوں کی گنگناہٹ سے زمین پر بکھر کر خاموش ہو گئے ہیں۔

اب ہر طرف سناٹا ہے' قبروں کے منہ بند ہو چکے ہیں' مردہ جسم اپنی اپنی قبروں میں گم ہو چکے ہیں' فضا میں ابھرتی ہوئی سرد آہیں خاموش ہو چکی ہیں۔ اس سارے قبرستان میں میرے سوا اب کوئی نہیں میرے سامنے کی زمین اندر کی طرف دھنستی چلی جا رہی ہے۔ میں جہاں کھڑا ہوں وہاں نہ سر پر آسمان ہے' نہ قدموں کے نیچے زمین' دونوں طرف خلاء ہے' ایک وسیع خلاء..... مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں بھی اس خلاء میں ہمیشہ کے لئے پوشیدہ ہو جاؤں گا اور پھر اس قبرستان میں ایک اور بے نام قبر کا اضافہ ہوگا۔!

میں زور زور سے قرآن کریم کی آیتیں پڑھنے لگتا ہوں۔ !!!!

☆☆☆☆☆

کوئی رونے والا نہیں

لاش جوان لڑکی کی تھی۔

سارا بدن زخموں سے چور تھا جلد پھٹی ہوئی تھی دونوں پیر پوری طرح پھیلے ہوئے ایک دوسرے پر رکھے ہوئے تھے جیسے سوتے ہوئے کسی نے پیر پر پیر چڑھا لیا ہو۔ چہرے پر وحشت تھی سکون کی ایک بھی لکیر نظر نہیں آرہی تھی۔ یہ لاش آج پورے دس دن بعد دریا کے کنارے ملی تھی۔ شاید پانی کی ایک تیز لہر دریا کے تہہ سے اُبھر آئی تھی اور لاش کو دھکیل کر کنارے تک لے آئی تھی۔

لاش کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا۔

''نہیں یہ صرف خودکشی کا معاملہ نہیں ہے۔'' ڈاکٹر خان نے آپریشن تھیٹر سے باہر آتے ہوئے کہا۔

''تو پھر ڈاکٹر'' میں نے پوچھا۔

''گھر والے کیا کہتے ہیں؟''

''جمیلہ۔ میرا مطلب ہے کہ لڑکی کے والد کا خیال ہے کہ ان کی بیٹی نے اپنے آپ کو ختم کرنے کے لئے دریا میں چھلانگ لگائی ہوگی۔''

''لیکن اس کے بدن پر زخم۔ وہ مرنا کیوں چاہتی تھی آپ نے پوچھا تھا ڈاکٹر اسلم؟''

''پوچھا تھا ڈاکٹر خان لیکن وہ کچھ نہیں جانتے، ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ بتانے سے ہچکچا رہے ہوں۔''

''ہاں یہ بات تو صحیح ہے کہ لڑکی نے دریا میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا یا یوں کہیے کہ خودکشی کرلی مگر؟''

''مگر ڈاکٹر خان''

''یہ زخم اس بات کے گواہ ہیں کہ لڑکی نے بڑی جدو جہد کی ہے۔''

''اپنی زندگی بچانے کے لئے۔''

''نہیں ڈاکٹر اسلم۔۔۔۔ اپنی آبرو بچانے کے لئے It is a case of gang rape'' ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔

میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ ڈاکٹر اسلم میر، اور یہاں اس ہاسپٹل میں پچھلی ایک دہائی سے ڈاکٹر خان کے ایک اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں اور ان برسوں میں ڈاکٹر خان نے اتنے پوسٹ مارٹم کئے ہیں کہ اب لوگ انھیں پوسٹ مارٹم ڈاکٹر کے نام سے جاننے لگے ہیں۔ ہر پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد ڈاکٹر خاموش ہو جاتے ہیں اور اُداس بھی آج بھی یہی صورت حال ہے ڈاکٹر اُداس ہیں اور فکر مند بھی۔

''اسلم۔''

''جی سر''۔

''پولس کو کہہ دیجئے کہ Legal formalities پوری کرنے کے بعد لاش وارثوں کے حوالے کی جائے۔''

''جی بہتر ڈاکٹر لیکن رپورٹ''

''ہاں میں ابھی رپورٹ لکھ دیتا ہوں مگر۔۔نہیں آپ پولس آفیسر سے کہہ دیجئے کہ جانے سے پہلے مجھ سے مل لیں، میں چاہتا ہوں کہ جن لوگوں نے یہ بدترین کام کیا ہے ان کی پہچان کی جائے Oh my God کیا ہو رہا ہے یہاں کیوں ہو رہا ہے اور کون کروا رہا ہے۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں اس قدر معصوم چہرہ نہیں دیکھا۔ اتنے دن پانی میں رہنے کے بعد بھی کتنی پاکیزگی ہے اس چہرے پر۔۔ بہار کے پہلے پھول کی طرح۔''

یہ کہہ کر ڈاکٹر خان ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ اور میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ پولس ہماری

منتظر تھی۔

''پوسٹ مارٹم ہو چکا ڈاکٹر اسلم۔''

''ہاں آفیسر۔''

''لاش کو لے جا سکتے ہیں۔''

''ہاں ہاں مگر خان صاحب سے ملنے کے بعد۔۔۔وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''کہاں ہیں وہ''

''وہ اپنے کمرے میں رپورٹ تیار کر رہے ہوں گے۔آپ جا کر مل لیجئے۔''

''آپ نہیں چلیں گے۔''

''میں OPD سے ہو کر آتا ہوں۔''

میں جب OPD سے لوٹ کر آیا پولس لاش لے کر چلی گئی تھی ڈاکٹر فون پر کسی سے بات کر رہے تھے ہاں اسی لڑکی کے بارے میں، میں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا میں ابھی اُن کے کمرے سے باہر آ ہی رہا تھا کہ اُن کی آواز سنائی دی۔۔۔''ڈاکٹر اسلم آپ کے وہ جرنلسٹ دوست ہیں نا احمد فواد کیا وہ مجھ سے مل سکتے ہیں۔''

''جی ہاں۔کب ملنا چاہیں گے آپ۔''

''آج ہی۔شام کا وقت ٹھیک رہے گا۔''

میں ایک بار پھر اُن کے کمرے سے باہر آیا اور احمد فواد کے لئے موبائیل ڈائل کرنے لگا۔

چند روز بے عنوان گزر گئے۔

اور ایک صبح اس بے عنوان کہانی کو عنوان مل گیا۔شہر کے اکثر اخباروں میں ایک آرٹیکل شائع ہوا۔جرنلسٹ احمد فواد کے قلم سے۔۔۔۔میں نے بھی یہ آرٹیکل پڑھا۔جو مجھے مبہم مبہم سا لگا شاید اس لئے کہ اس پورے آرٹیکل میں نہ تو اس لڑکی کا ذکر تھا اور نہ ہی ڈاکٹر خان کا لیکن ہر بار پڑھنے کے بعد میری نگاہوں کے سامنے دو تصویریں گھوم جاتیں ایک اس لڑکی کی، جس کا گینگ ریپ ہوا تھا اور دوسری

ڈاکٹر خان کی لیکن میں جانتا تھا کہ اس آرٹیکل کے پس منظر میں جو الفاظ پوشیدہ ہیں وہ صرف اور صرف اس لڑکی کی ترجمانی کرر ہے ہیں اور ملزم۔ اُن کی جانب اشارہ تو تھا لیکن واضح نہیں۔ میں نے ڈاکٹر خان سے پوچھنا چاہا لیکن وہ خاموش رہے۔ ادھر احمد فواد سے بھی ملاقات نہ ہوسکی اور جب ہوئی تو اس نے دبے دبے لہجے میں صرف اتنا کہا کہ ڈاکٹر خان کو پوسٹ مارٹم کرتے وقت کوئی ثبوت ہاتھ آیا ہے جس کی بنا پر ملزموں کی نشاندہی آسانی سے ہوسکتی ہے۔ بلکہ ہو بھی چکی ہے۔''

''کیسا ثبوت۔ میں خود آپریشن تھیٹر میں موجود تھا''میں نے پوچھا۔

''ڈاکٹر اسلم۔۔۔کاغذ کا ایک پرزہ جو اس معصوم لڑکی نے اپنے لباس میں چھپا رکھا تھا جانتے ہو کیا لکھا تھا۔ ریپ کرنے والوں کے نام؟''

''آپ۔۔آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس معصوم اور پاکیزہ لڑکی کے بدن کو داغدار بنانے والوں کی پہچان ہوگی۔''

''ہاں ہاں ڈاکٹر اسلم۔ اب قانون کی نظروں سے چھپے رہنا ان کے لئے مشکل ہوگا۔''

یہ اب سے سات سال پہلے کہ بات ہے۔ اور ان سات سالوں میں یہ دھرتی اور بھی اجڑ کر رہ گئی۔ باغبانوں نے اپنے ہی مرغزاروں کو جلا دیا، سائبان بن کر اپنے ہی گھروں کو مسمار کردیا۔ وہ ساری رونق جو ہماری زندگی کے رنگوں سے بندھی ہوئی تھی جانے کہاں کھوگئی۔ ہماری کھلکھلاتی بستیاں اور لہلہاتی کھیتیاں کس نے چھین لیں۔ کیوں اور کیسے صحرا کا روپ اپنا چکی ہماری یہ شاداب زمین۔۔۔۔ اور تو اور ڈاکٹر خان خود کسی نا معلوم بندوق بردار کی گولی کا نشانہ بنتے بنتے ابدی نیند سو گئے۔ کیا قصور تھا اُن کا۔۔۔۔اور پھر ایک رات احمد فواد جرنلسٹ کے دفتر میں آگ نمودار ہوئی اور آناً فاناً اس کی زندگی کا سارا اثاثہ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگیا۔ ایسا کیوں ہوا، اس کی تحریریں تو سچائی کی ترجمانی کرتی تھیں۔

کوئی رونے والا نہیں۔

میں ابھی ابھی پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آ گیا ہوں۔ آپریشن ٹیبل پر جس لڑکی کی لاش پڑی ہے وہ بھی گینگ ریپ کا شکار ہوئی ہے۔ پولس ابھی آ رہی ہوگی پوسٹ مارٹم رپورٹ لینے کے لئے ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے میرا فرض بنتا ہے کہ پوسٹ مارٹم کرتے سمے جو ثبوت میرے ہاتھ آئے ہیں وہ میں پولیس کے سامنے رکھوں۔ اپنی رپورٹ میں لکھ دوں، سوچ رہا ہوں میرا ایسا کرنے سے کیا ان کے لمبے ہاتھ مجرموں کو چھو سکیں گے۔؟ ہاں میں جانتا ہوں اور مجھے احساس ہے کہ ایسا کرتے ہی کسی اَن دیکھی بندوق سے گولیاں اُگلیں گی جو میرے وجود کو لہولہان کر دیں گی۔ پھر مجھ پر بھی کوئی رونے والا نہیں ہوگا۔۔۔؟!

☆☆☆☆☆

کرب ریزے

بہت دنوں سے کہانی لکھنے کی کوشش کررہی ہوں لیکن لکھ نہیں پارہی ہوں، ذہن میں بہت سے موضوع ہیں لیکن کس موضوع کو اپنے قلم کی سیاہی میں تبدیل کروں سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ ماضی میں جھانکتی ہوں تو ان گنت کردار نظروں کے سامنے گھومنے پھرنے لگتے ہیں لیکن ماضی تو اب حال کا روپ اپنا چکا ہے اور حال آنے والے دنوں میں مدغم ہوکر مستقبل بن جائے گا، مستقبل میں کیا ہوگا میں نہیں جانتی۔ کوئی بھی نہیں جانتا، قدرت کے کھیل کس قدر انوکھے ہیں یہ سارے کھیل ہمارے لئے اَن جانے ہیں، اَن دیکھے ہیں۔ ماضی میں میرا کشمیر تابناک رہا ہے لیکن اب ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جیسے زندگی کی بے شمار خوشیوں اور مسرتوں سے گذرنے کے بعد درد و کرب سے ہم آغوش ہو چکا ہے۔ جب میں کہانی کی تہہ میں جانے کی کوشش کرتی ہوں تو لگتا ہے کہ اب خوشیوں اور مسرتوں کی ساری رنگینیاں زندگی کے کینواس سے غائب ہو چکی ہیں اور زندگی صلیب پر لٹکی ہوئی ہے!!

میں اپنی انگلیوں کی مدد سے اپنے قلم کو جنبش دے رہی ہوں!

❀❀

نومبر کے مہینے کو میری زندگی سے گہرا تعلق رہا ہے، میں نومبر میں پیدا ہوئی، نومبر میں لندن چلی گئی جہاں میں بارہ سال رہنے کے بعد نومبر میں کشمیر لوٹ آئی۔ میں جب لندن چلی گئی تب نومبر 1987ء کی آٹھ تاریک تھی اور جب میں لوٹ کر آئی وہ نومبر 1999ء کی پانچ تاریخ تھی۔ جب میں یہاں سے گئی تھی تب میرا کشمیر رنگ رنگ کے پھولوں کا سندر، خوبصورت باغ تھا۔ تب یہ پھول میرے تھے، تب یہ نہ میرے لئے اجنبی تھے اور نہ میں ان کے لئے پرائی تھی، تب میں سوچتی تھی۔۔۔ میں سپیدے کا درخت ہوں، چنار کا سایہ ہوں، برفیانی چوٹیوں پر چمکنے والی بجلی ہوں، پہاڑوں پر گرنے والی برف ہوں، جھیل کی لہر ہوں، سنہری چڑیوں کا راگ ہوں، میں کشمیر کی مٹی ہوں، کشمیر کا دل ہوں اور اب

جب میں بارہ برس بعد اپنے کشمیر کو دیکھ رہی ہوں تو مجھے سب کچھ پرایا پرایا سا لگتا ہے۔ سب کچھ بدل گیا ہے یہاں' اب شاید اس دھرتی پر سورج کی روشنی نہیں پڑتی۔ اس دھرتی پر قدم رکھتے ہی' اس مٹی کو چھوتے ہی میں سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکی ہوں۔ میری واپسی کیوں اور کس لئے۔۔۔ لیکن مجھے آنا پڑا' آنا ہی پڑا بارہ سال بعد جبکہ میں نے اپنے دل کے سارے دروازے بند کر لئے تھے' منہ موڑ لیا تھا۔ اپنے بچپن اور لڑکپن سے' اُن کی یادوں سے' اُن کی پاکیزگی سے مگر دل کے اندر سے کوئی صدا آرہی تھی' وہ آواز کافی جانی پہچانی تھی۔۔۔ اُسی آواز کی تلاش میں لوٹ آئی۔

❀❀

میں ٹیکسی میں بیٹھ چکی ہوں اور ٹیکسی چل پڑی ہے۔

''کہاں چلنا ہے میم صاب''

''سلطان پورہ''

''آپ تو یہیں کی ہیں' میں سمجھ رہا تھا کہ آپ پردیسی ہیں''

''پردیس سے اپنے دیس آرہی ہوں۔۔۔ اِس قدر تیز نہ چلیئے۔۔۔ سپیڈ دھیمی کر لیجئے' یہاں آس پاس میرا اسکول ہوا کرتا تھا۔۔۔ وہاں' اُس طرف' ہاں اُس جگہ!''

''آپ اِس جگہ کو پہچانتی ہیں''

''ہاں''

''ایک بات بتا دوں''

''ہاں بتا دیجئے''

''اب ہر چیز کے ساتھ آپ کو تھا یا تھی جوڑنا پڑے گا''

''کیا مطلب''

''جیسے یہاں امن تھا' بھائی چارہ تھا' محبت اور چاہ تھی' ایک دوسرے پر اعتبار اور اعتماد تھا۔۔۔ سب کچھ نظر بد کا شکار ہو گیا''

''ذرا اور آہستہ۔۔ یہاں سڑک کے اُس طرف موتی سنیما ہوا کرتا تھا''

''میڈم یہ تھا ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔۔۔ یہ پوچھیئے کہ اب یہاں کیا ہے''

''کیا ہے یہاں''

''آپ کتنے دنوں بعد کشمیر آرہی ہیں''

''بارہ برس بعد''

''بارہ سال۔۔۔۔اب کچھ بھی نہیں بچا ہے یہاں جو آپ پہچان سکیں گی۔۔۔دیکھئے آپ کی منزل آچکی ہے'میں گاڑی روک لیتا ہوں۔۔۔اگر آگے چلنا ہوتو بتا دیجئے۔''

''نہیں روک لیجئے۔۔۔کتنا ہوا''

''اب میں کیا بتاؤں' اپنی سمجھ سے کچھ بھی دیجئے''

''آپ شاید بھول گئے کہ میری سمجھ بارہ سال پرانی ہے''

''تین سو روپیے''

''تین سو روپیے زیادہ نہیں ہیں کیا؟''

''جی ہاں' یا تو میرا حق سمجھ کر دیجئے یا میری ضرورت سمجھ کر۔کل کا حال اُوپر والا ہی جانتا ہے!''

میں گھر کے دروازے پر کھڑی دروازہ کھٹکھٹا رہی ہوں' دروازہ کھُلتے ہی ایک معصوم سی' چھوٹی سی لڑکی سامنے نظر آتی ہے۔

''آپ کون ہیں' بولیئے کیا چاہئے آپ کو''

''تم کون ہو''

اندر سے آواز سنائی دیتی ہے۔۔''سیرت فوراً اندر چلی آؤ۔''

''آرہی ہوں دادی ماں' ایک منٹ میں''

''زرا دیر بعد ایک اڈھیڑ عمر کی بیمار بیمار سی عورت دروازے پر نمودار ہوتی ہے۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی ہے اور میں اُس کی آنکھوں میں جھانک رہی ہوں''

''تم نے خبر دی ہوتی تو کوئی لینے آتا''

''لانے والا بچا ہی کون ہے یہاں''

''آؤ''

''کیسی ہو ماں''

''اندر چلو، اِن کپڑوں میں باہر رہنا مناسب نہیں''

❀❀

''گلوری بھابی آپ نے اپنا یہ کیا حال بنایا ہے''

''شکر ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا''

''لندن میں جو چہرہ میری یادوں میں محفوظ تھا وہ کسی اور گلوری بھابی کا تھا''

''ہاں میرا چہرہ لندن چلا گیا اور جوان رہا' میں یہیں رہ گئی اور وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہو گئی''

''مجھے تمہارے دُکھ کا احساس ہے''

''جب تمہارا بھائی اذیتیں دے دے کر مارا گیا تب مجھے بہت دُکھ ہوا تھا نورا اور اب۔۔۔ اب میں اکیلی نہیں ہوں' مجھ جیسی جانے کتنی خواتین ہیں جو میری ہی طرح حالات اور واقعات کا سامنا کر رہی ہیں۔ مجھے رہنے کے لئے گھر ہے اور پہننے کے لئے کپڑے بھی۔۔ سیرت بھی ہے میرے ساتھ اور میں سیرت کو اپنے سینے سے لگا کر اپنا درد بانٹتی ہوں۔۔۔ اُن کے پاس تو کچھ بھی نہیں۔۔ بے سہارا ہیں وہ' بے گھر ہیں وہ۔۔۔ پہننے کے لئے کپڑے نہیں' کھانے کے لئے روٹی نہیں۔۔۔ کیا بتاؤں۔۔۔ کیسے بتاؤں نورا۔۔۔!''

''بھابی یہاں آ کر مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے ہر کوئی رو رہا ہے' ہر کوئی چیخ رہا ہے لیکن آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہر کوئی اپنے سینے پر پتھر رکھ کر اَن دیکھی آگ کی تپش میں جُھلس رہا ہے' یہاں سب کچھ تہس

نہس ہو چکا ہے دِن کی روشنی میں بھی مہیب سناٹوں کا احساس ہوتا ہے۔''

''ہاں نورا۔۔۔اِس کے علاوہ کر ہی کیا سکتے ہیں' تم جو کہہ رہی ہو وہ سچائی ہے' تم جو دیکھ رہی ہو وہ حقیقت ہے۔۔ یہاں اب ہر کوئی سچائی اور حقیقت کی صلیب پر لٹکا ہوا ہے۔۔۔تم یہاں آئی بھی جب یہاں کچھ بھی نہ رہا۔۔۔یہ جو تم دیکھ رہی ہو نا وہ راکھ ہے' دھواں ہے' آگ ہے' وحشت ہے' دہشت ہے۔۔۔!''

''بھابی خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ میں یہ سب کچھ جاننا نہیں چاہتی' سننا نہیں چاہتی''

''لیکن نورا یہی سچائی ہے اور یہی حقیقت ہے!''

''ابو آپ کیسے ہیں''

''تم اتنے سال کہاں رہی نورا''

''لندن میں۔۔آپ ہی نے تو میرا فارم بھرا تھا' میرے لندن جانے کے لئے سارے اِنتظام کئے تھے''

''ہاں ہاں' میں نے ہی تمہیں فلم اور ٹیلی وژن میں ڈگری حاصل کرنے کے لئے لندن جانے کو کہا تھا' لیکن تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔۔۔تم اپنوں سے دور ہوگئی' بہت دور۔۔۔۔!''

''اور وہ جو آپ کے نزدیک تھے وہ بھی تو دور ہو گئے' بہت دور۔۔۔!''

''مجھے یہ سب کچھ یاد نہ دلاؤ نورا۔۔۔۔میں یہ سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں''

''ابو''

''کہو بیٹا''

''میں اپنے بھائی کی قبر دیکھنا چاہتی ہوں' اُس مٹی کو چھونا چاہتی ہوں''

''بیٹا ان لاتعداد قبروں میں کیسے تلاش کرو گی اپنے بھائی کی قبر۔۔''

''کیا''

''ہاں بیٹا وہاں بہت ساری بے نام قبریں ہیں''

''میں وہاں جا کر اُن سب بے نام قبروں پر اپنی عقیدت اور محبت کے پھول نچھاور کرنا چاہتی ہوں، اُس مٹی کو چھونا چاہتی ہوں جس نے میرے بھائی جیسے اَن گنت معصوموں کو اپنی آغوش میں چھپا رکھا ہے۔۔۔!''

❀❀

زندگی کا یہ سفر بھی کس قدر عجیب سفر ہے، کبھی دو قدم چلنے کے بعد ہی منزلوں کے نشان عیاں ہوتے ہیں اور کبھی طویل تر مسافت طے کرنے کے بعد منزل کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔۔۔ میری یہ کہانی صرف میرے گھر تک محدود ہے، یہ تو صرف میرے گھر کی کہانی ہے لیکن میرے گھر سے باہر بھی ایسی سینکڑوں کہانیاں میری تلاش میں ہیں، دراصل میرے گھر کی کہانی ہر گھر کی کہانی ہے۔۔۔ کشمیر کی کہانی ہے اور کشمیر کی کہانی صلیب پر لٹکی ہوئی ہے۔ منزل دور سہی لیکن سفر جاری ہے۔۔۔!!!

اُڑان

وہ قبرستان کے عقب میں بستی کی سب سے اونچی مسجد تھی اور شاید سب سے پرانی بھی۔ اس مسجد کی بڑی خوبصورتی اس کا گنبد تھا۔ اس گنبد پر ہمیشہ اڑتے ہوئے پرندے رُک رُک کر جانے کیا تلاش کرتے رہتے لیکن اب کئی روز سے وہاں کوئی پرندہ نظر نہیں آرہا تھا۔ جیسے سارے پرندے آسمان کی وسعتوں میں کھو گئے ہوں۔ اُن انسانی جسموں کی طرح جو کبھی چل پھر سکتے تھے۔ ہنس سکتے تھے، رو سکتے تھے لیکن اس قبرستان کی نئی پرانی قبروں میں ہمیشہ کے لئے پوشیدہ ہو گئے تھے، بے حرکت، بے آواز لیکن آج بہت دنوں بعد ایک بوڑھا عقاب گنبد پر آکر رُک گیا تھا اور قبرستان کی جانب مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔

گرمی خوب تھی۔ بوڑھا عقاب اپنے سر کو پیروں میں ڈھانپ کر بیٹھ گیا لیکن وہ اپنی کھلی کھلی آنکھوں سے نئی پرانی قبروں میں شاید کچھ تلاش کر رہا تھا۔ شاید اپنا بچپن، اپنا لڑکپن یا پھر اپنی جوانی۔ اب سے چھ سال قبل جب وہ پہلی بار اس گنبد پر آکر رُک گیا تھا تب یہاں نہ اتنی قبریں تھیں اور نہ ہی قبرستان اس قدر پھیلا ہوا تھا لیکن اب یہاں لاتعداد اور ان گنت قبریں ہیں۔ آسمان کی وسعتوں میں اُڑتے ہوئے پرندوں سے بھی زیادہ!

دفعتاً کرکراہٹ کی آواز آئی۔ عقاب نے اپنے سر کو جنبش دی اُسے لگا جیسے کوئی مردہ قبر سے باہر نکل آیا ہو۔ عقاب اپنے بازو پھڑ پھڑا کر ہوشیار ہو گیا۔ سامنے سے کوئی آرہا تھا۔ ہاں یہ کسی انسانی ڈھانچے کی کرکراہٹ تھی۔ جیسے کوئی سوکھے ہوئے پیڑ سے ٹہنیاں توڑ رہا ہو!

''کون ہو تم'' عقاب نے پوچھا

''جب میں تمہاری دنیا میں تھا تو بول سکتا تھا۔ سن سکتا تھا اور اب اس دنیا میں مردہ جسم کا ایک

مستقل پنجر۔''

''میری دنیا چھوڑ کیوں دی تھی''

''تم آسمان کی بلندیوں میں تب بھی اڑتے تھے اور اب بھی اڑ رہے ہو اور ہم۔۔۔۔ہم نے جب تمہاری طرح بلندیوں کو چھونے کی کوشش کی، آزاد فضاؤں کو چھونے کی آرزو کی۔تہذیبی قدروں کی آبیاری اور انسانی عظمت کی بلندیوں کے لئے اپنی آواز بلند کی تو ہم سے ہماری دنیا چھین لی گئی۔ ہمارے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں۔ ہمارے لئے دو قدم چلنا مشکل ہو گیا۔ اور جب ہم نے اپنے پاؤں کو اپنے وجود کو ان بیڑیوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی تو ہماری بے بس بے حرکت اور بے آواز جسموں کو ان قبروں کی گہرائیوں میں دھکیل دیا گیا۔''

''اور اب۔۔۔۔۔اب کیا لینے آئے ہو۔''

''ذرا سی آہٹ سنائی دی تو قبروں کے اندھیاروں سے باہر نکل آیا۔ یہ دیکھنے کے لئے شاید صبح کی بے داغ روشنی نے اس دھرتی کو اپنی آغوش میں لے لیا ہوگا لیکن یہاں۔۔۔۔یہاں تو اب بھی گھٹن ہے، مایوسی ہے، خالی ہاتھ اور خالی پیٹ ہیں، خون خرابہ ہے، ناانصافی اور نابرابری کا ماحول ہے، ظلم ہے اور ظالم بھی، بندوق ہے اور بندوق سے اُگلتی گولیاں بھی۔۔۔۔۔ یہاں ہر صبح اپنے ساتھ موت کا پیغام لاتی ہے اور ہر رات لاتعداد روحیں بھٹک کر رہ جاتی ہیں۔''

بوڑھا عقاب چونک پڑا، اُس نے سوچا کہ اس کی دنیا اور میری دنیا میں اگر کوئی چیز مشترکہ ہے تو وہ پیاس اور بھوک ہے۔ یہ سوچتے ہی اُسے پیاس اور بھوک کا احساس ہونے لگا۔ یہ بھوک اور پیاس اُسے موت بھی دے سکتی تھی اور پھر مرنے کے بعد وہ بھی انسان کی طرح سوکھی اور بے رس ہڈیوں کا ایک پنجر رہ جائے گا۔اس نے اپنی آنکھوں کو دو تین بار گھمایا اُنکی روشنی تیز ہو گئی۔ اب وہ جلتے ہوئے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔اُس نے اپنے شکار کو جان لیا تھا، پہچان لیا تھا، اس کا شکار نظروں کے ٹھیک سامنے تھا۔ وہ سامنے مینا کو دیکھ رہا تھا۔ جو اپنے گھونسلے میں اپنے معصوم سی بچی کے خشک ہونٹوں کو اپنے گرم گرم آنسوؤں سے تر کر رہی تھی۔اس کے پیاس بجھا رہی تھی۔اُسے زندہ رکھنے کے لئے زندگی

دینے کے لئے۔عقاب کی ایک ذراسی اُڑان، مینا اور اُس کی بچی کی زندگی کا آخری لمحہ۔۔۔گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اور خون کی چند بوندیں۔۔۔۔۔۔گوشت کا یہ ٹکڑا اُس کی بھوک مٹا سکتا تھا اور خون کی یہ بوندیں اُس کی پیاس!

جانے پھر کیا ہوا، گنبد کے اندر سے چند آوازیں گونجیں!

تو بڑا رحیم ہے۔۔۔۔۔۔۔۔رحم کرنے والا

تو بڑا رزاق ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔رزق دینے والا

بوڑھے عقاب کی آنکھوں سے جلتے ہوئے آنسوؤں کی دو بوندیں ڈھلک آئیں اور اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کی پیاس بجھ گئی ہو۔اُس کی بھوک مٹ گئی ہو۔۔۔۔۔۔!

اور پھر بوڑھا عقاب اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتا ہوا آسمان کی آزاد فضاؤں میں اڑ گیا۔!!

☆☆☆☆☆

لمبی عمر کی لکیریں

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پُرسکون ماحول ایک خوف زدہ روپ اختیار کر گیا۔ ابھی ابھی سب کچھ ٹھیک تھا۔ ہر سمت ہلچل تھی۔ ایک بھرپور زندگی تھی۔ زندگی کی روح پرور رعنائیاں تھیں۔ آکاش کی وسعتوں میں سورج ہنس رہا تھا...... اور پھر قریب سے کوئی چیز پھٹنے کی آواز سنائی دی۔ دھواں سا اٹھا جیسے آکاش کی نیلی گہری وسعتوں میں کالی گھٹائیں پھیل گئی ہوں۔ دھوئیں کے کثیف بادل اٹھ اٹھ کر بکھر گئے ہوں، ہواؤں کی لوریاں خاموش ہوگئی ہوں...... اور پھر گولیاں چلنے کی آوازیں بکھر گئیں۔ بچاؤ اور بچاؤ کی آوازیں اُبھرنے لگیں، سورج کی ہنسی اَن دیکھے لمحوں کے شور میں گم ہوگئی۔ دھوپ کی حرارت بے بسی کے عالم میں اس دھوئیں میں تحلیل ہوگئی...... اور پھر ایک معصوم سی چیخ سنائی دی اس چیخ کے ساتھ ہی ہر سمت ایک سناٹا سا چھا گیا۔ گولیاں چلنے کی آوازیں بند ہوگئیں......... اور پھر اس سناٹے میں لوگوں کے قدموں کی دھیمی دھیمی آہٹیں ابھرنے لگیں وہ سارے قدم سڑک کی اُس جانب بڑھ رہے تھے جہاں سے یہ چیخ سنائی دی تھی۔ ان قدموں میں ایک بے بسی تھی ایک ویرانی تھی ان لوگوں میں میں بھی شامل ہوگیا۔ سامنے سڑک پر دس بارہ سالہ عمر کے ایک لڑکے کی لاش پڑی تھی، خون سے لت پت، بہت خون بہہ چکا تھا، احساسات اور خیالات موت اور زندگی کی پیچیدگیوں میں کھو کر اذیت ناک کیفیتوں سے گذر رہے تھے، میری نگاہوں کے سامنے وقت کا تیز لاوا بہا اور جم گیا...... ایک چہرہ میرے سامنے تھا، دودھیا رنگ سے بھرے بھرے سادے ہونٹ، چھوٹی سی ناک اور اس چہرے میں پوشیدہ معصومیت، پاکیزگی اور تقدس...... وہ بچہ جس نے نہ دنیا دیکھی تھی اور نہ ہی دنیاداری۔ کراس فائرنگ میں اپنی جان کھو چکا تھا اُس کی کتابوں سے بھرا بستہ چھلنی ہو چکا تھا اور کتابیں سڑک پر بکھری پڑی تھیں، ان کتابوں میں پوشیدہ علم سرخ سرخ خون کا روپ اپنا کر سڑک پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے

جھک جھک کر ڈر ڈر کر معصوم سے بے جان جسم کو چھونے کی کوشش کی لیکن اس کی جان، اس کی زندگی جانے کس کی اور کس طرف سے آنے والی بندوق کی گولی کی نذر ہو چکی تھی۔ میں نے ایک بار اس کی کھلی کھلی آنکھوں کی جانب دیکھا، آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی تاریکی میں سرخ سرخ دھبے پڑ گئے تھے اور پھر میرے سوچتے سوچتے وہ دھبے جیسے دو کھلی کھلی آنکھوں میں تبدیل ہو گئے، سرخ سرخ شعلہ بار آنکھیں ...... پھر قریب سے ایک آواز سنائی دی .... ہاسپٹل لے چلو........ شاید........ ہاسپٹل کا نام سنتے ہی میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کیا لیکن اس کے دائیں ہاتھ کی لمبی عمر کی لکیریں اس کی بے وقت موت پر بے تحاشا ہنس رہی تھیں........!!

بے وقت کی موت! ایک معصوم سی موت! لمبی عمر کی لکیروں کی موت...... رات کو میں جب گھر لوٹا تو میرے چہرے پر بکھری ہوئی اداسیوں کو دیکھ کر میرے گھر والے حیران نہیں ہوئے۔ یہ اُداسیاں پریشانیاں شاید ان کے لئے نئی نہ تھیں۔ میں بھی خاموش رہا اور سوچتا رہا وہ تو مر گیا جس کے ہاتھ کی لکیریں اس کی لمبی عمر کی کہانی کو دہرا رہی تھیں، لیکن میں اُداس کیوں ہوں، میرے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہ تھا مرنے سے پہلے میں نے اسے کبھی دیکھا بھی نہ تھا..... لیکن شاید کوئی رشتہ تھا، کوئی قربت تھی، اس کی شاید کوئی اپنی پہچان تھی، اسی لئے تو اداس ہوں اسی لئے تو سوچ رہا ہوں...... ہاں وہ مر گیا لیکن اسے کس نے مارا، کیوں مارا، کس قصور میں مارا....... کیا مارے والا کوئی نقاب پوش تھا یا کوئی وردی پوش یا اپنی مٹھی بھر سیاسی دنیا کو سجانے والا کوئی کھدر پوش یا ٹوپی پوش....... کوئی تو تھا، زمیں جب اپنی زباں کھولتی ہے تو اتہاس کی کڑیاں مل جاتی ہیں پھر آہستہ آہستہ اتہاس کی یہ کڑیاں کتابوں میں دفن ہو جاتی ہیں، ہم سب کی لمبی عمر کی لکیروں کی طرح....... لکیریں!

☆☆☆☆☆

نہ کہی جانے والی بات

اس کہانی میں صرف دو کردار ہیں!

میں اور وہ!!

پہلے اپنی بات کروں گا، میں ایک فوجی ہوں، میرا مطلب ہے کہ میں ایک فوجی آفیسر ہوں، نام ہے دیال...... کیپٹن دیال..... ٹریننگ ختم کرنے کے بعد مجھے سائینٹیفک اینڈ ریسرچ ونگ میں پوسٹنگ ملی۔ مجھے اُس ونگ میں شاید اسے لیے تعنیات کیا گیا کہ میرے تعلیمی بیک گراؤنڈ میں سائنسی مضامین کو ایک اچھا خاصا دخل رہا ہے۔ اس ونگ میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ہر کام نہایت راز داری سے ہوتا ہے، ذراسی غفلت، ذراسی لاپرواہی نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے بلکہ فوجی اعتبار سے خطرناک روپ اختیار کرسکتی ہے۔

اور وہ...... اس کا نام رتنا ہے۔

میں ایک شام جنرل بُک شاپ میں مختلف کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف تھا کہ اچانک کتابوں کا ایک ریک کتابوں سمیت نیچے آگیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک لڑکی کتابوں کے نیچے قریب قریب دب چکی تھی میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھاما اور کھڑا ہونے میں مدد کی۔ اتنی دیر میں بُک شاپ میں کام کرنے والے لڑکے بھی آگئے۔ کتابوں کو پھر سے ترتیب دیا گیا۔

''مجھے افسوس ہے'' اس نے کہا۔ ''اچانک آواز سُن کر گھبرا تو نہیں گئے آپ؟''

''نہیں تو..... ہم فوجی لوگ ذراسی آواز سے گھبرانے لگے تو ملک کی سرحدوں کی حفاظت کون کرے گا۔''

''اچھا تو آپ آرمی میں ہیں؟''

''میرا نام کیپٹن دیال ہے۔''

''اور میں رتنا ہوں، رتنا کپور، یہاں یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہوں۔''

اس کے بعد ہم دونوں بک شاپ سے باہر آ گئے۔

''چائے، کافی یا......''

اس نے کوئی جواب نہ دیا، لیکن ہم دونوں کچھ کہنے بغیر ساتھ والے کافی بار میں گھس گئے۔ کافی کی چسکیاں لیتے سمے مجھے اسے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ خوبصورت تھی بھرا بھرا جسم، روشن کتابی چہرہ گلابی آنکھیں ہونٹوں پر پھیلتی ہوئی حلیمانہ مسکراہٹ اُجلے گہرے کالے بال شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ گورے گداز سینے کی گولائیاں کشمیری سیب جیسی لگتی تھیں۔ اور پھر اس کے باتیں کرنے کا انداز، مجھے تو بیحد پیارا لگا۔

''آپ کسی خاص کتاب کی تلاش میں تھیں؟''

''نہیں تو..... مجھے وار بکس پسند ہیں۔''

''وار بکس، جنگ سے متعلق کتابیں..... پسند کرنے کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے انکل بھی فوج میں تھے، اب وہ ریٹائر ہو چکے ہیں، وہ ہمیں جنگ کے بارے میں بڑی دلچسپ اور عجیب عجیب سی باتیں بتایا کرتے تھے۔ ان کو سُن سُن کر وار بکس پڑھنے کی عادت پڑ گئی اور بس...... اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں..... اور ہاں''......

''اور کیا؟''

''آئی لائیک آرمی آفیسرز''

مجھے لگا جیسے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور میرے سارے وجود کو شاداب کر کے جانے کہاں گم ہو گیا۔ جیسے ہرے، پیلے اور سنہری پنکھوں والی تتلی نظروں کے سامنے سے گذری اور سارے ماحول کو رنگین بنا کر سپید گلاب کی گود میں سو گئی۔

''کیا سوچنے لگے آپ؟''

''کچھ بھی نہیں، میں ..... ''

''اور میں سوچ رہی ہوں کہ ان دنوں دہشت گردی کو ختم کرنے کی آڑ میں جو جنگ لڑی جارہی ہے وہ دراصل دہشت گردی کے خلاف نہیں ہے بلکہ جنگ کی آڑ میں دہشت گردی کو فروغ دیا جارہا ہے۔۔اور امریکہ اس کی ایک بڑی مثال ہے۔''

''اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہم سب مایوسی اور نا اُمیدی میں گھرے ہوئے ہیں.... ویسے امریکہ یا کوئی دوسرا ملک..... ''

''جانے بھی دیجیے.... پھر کبھی بات کریں گے۔''

''پھر کب؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

''کل شام.... اسی سمے..... اسی جگہ..... ''

اور پھر ہم ملتے رہے۔ ہر بار اس سے مل کر محسوس ہوتا جیسے ابھی ابھی کوہِ قاف کی سبز پری جنت سے ہو کر اُتر آئی ہے اور خوابوں کے چراغ جلنے لگے ہیں یہ چراغ جلتے رہے، بے زبان تحریروں کو زبان ملتی رہی، محبت محبت میں تبدیل ہوتی رہی!

اور ایک دن اچانک اس نے میرے ساتھ آرمی میس میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔'' آرمی میس میں کئی بار جا چکی ہوں لیکن تب میں چھوٹی تھی۔ وار بُکس میں بھی اکثر آرمی میس کی باتیں دہرائی جاتی ہیں۔ سُنا ہے بہت دلچسپ ماحول ہوتا ہے وہاں۔۔۔تمھارے ساتھ دیکھنا چاہتی ہوں۔ مشاہدہ کرنا چاہتی ہوں۔''

''اوہ ضرور'' میں نے کہا

اور پھر وہ ایک شام میرے ساتھ آرمی میس آئی، میں نے اسے ڈنر کے لیے مدعو کیا تھا۔ وہ شام دوسرے شاموں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ میرے ساتھیوں کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی جیسے وہ ان کے لیے اجنبی نہ تھی، ان میں سے ہی ایک تھی۔ وہ میرے ساتھیوں کی خشک زندگی میں ایک پھوار بن کر آئی تھی، ایک پھول بن کر ان کے دل کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ ایک نغمہ بن کر اُن کے

اندر کے خشک دریا پر بارش کی مانند قطرہ قطرہ برس رہی تھی۔ لیکن آرمی میں اپنا ایک ڈسپلن ہوتا ہے۔

اور اس پُر خلوص، پُر سکون اور نہایت ہی خوشگوار ماحول میں رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ فلموں کی باتیں، سماجی اور سیاسی باتیں، فوجی اور غیر فوجی باتیں..... اور پھر شعر سُنا سُنا کر رتنا نے اپنی آواز کا جادو جگا دیا۔

پھر وہ کئی بار وہاں آئی اور یہ بات ہمارے بڑے صاحب تک جا پہنچی اور ایک شام میس میں آ کر ہم سب کو چونکا دیا میں تو بیحد گھبرا گیا لیکن کانتا مسکرا رہی تھی اور مسکرا مسکرا کر بڑے صاحب کی ہر بات کا جواب دے رہی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے اپنے انکل کا نام لیا، بڑے صاحب ان کو جانتے تھے وہ کافی دیر تک ان کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔

جاتے جاتے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا ''لڑکی اچھے گھر سے تعلق رکھتی ہے۔ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

اور اب رات کافی اُتر چکی تھی۔ کانتا کو چھوڑنے میں اس کے فلیٹ تک گیا اور کافی پینے کے لئے اس کے بیحد اصرار پر رُک گیا۔ وہ کافی بنانے کے لئے کچن میں گئی اور میں ریک میں پڑی کتابوں کو دیکھنے لگا۔ وہاں مجھے دو طرز کی کتابیں نظر آئیں۔ وار بکس اور سیکس بکس وہ جب کافی لے کر آئی تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنا لباس بھی تبدیل کر چکی تھی۔ مہین ریشمی لباس میں اس کا روپ اور نکھر آیا تھا۔۔ اور پھر وہی ہوا جو میں نے سوچا تک نہ تھا۔ راز کو ہم راز مل گیا۔ میں نے اپنے آپ کو روکنا چاہا، تیزی سے حرکت کرتے ہوئے جسم کو ٹھہرانا چاہا..... لیکن میں رُک نہ سکا اور نہ ہی وہ رُک سکی۔ آگ دونوں طرف لگ چکی تھی، ہماری آوازیں تیز اور مدھم ہوتی رہیں۔ اور جب آگ بجھ گئی تو صبح ہو چکی تھی۔

میں یونٹ لوٹ آیا۔ میرے ساتھی مجھے دیکھ کر صرف مسکراتے رہے۔

چند روز بے عنوان گزر گئے!

اب اس کہانی میں ایک اور کردار آ گیا ہے، لیکن یہ کردار بالکل مختلف ہے، الگ ہے، اس میں کوئی زندگی نہیں، کوئی حرارت نہیں، بے حس، خاموش اور بے آواز ہے۔ ہاں میں ان تصویروں کی بات

کر رہا ہوں جو مجھے ابھی ملی ہیں ۔ یہ تصویریں ان لمحوں کی کہانی کو دہرا رہی ہیں جب میں نے اور کانتا نے دو جان ایک قالب کا روپ اپنا لیا تھا۔

تصویروں کے ساتھ ایک مختصر چھٹی بھی تھی ۔لکھا تھا....

"کیپٹن دیال۔۔۔آپ کے باس کے چیمبر میں ٹیبل کے دائیں دراز میں جو پیلے رنگ کی فائل پڑی ہے اور جس پر تھرڈ آپریشن لکھا ہوا ہے مجھے اس کی زیراکس کاپی کی ضرورت ہے۔آج ہی بھجوا دیجئے ورنہ یہ تصویریں.....!

گڈ بائی اینڈ گڈ لک..... کانتا کپور

اور یہ کہانی یہیں پر ختم ہوتی ہے۔!!!

☆☆☆☆☆

درد آتا ہے دبے پاؤں

دھوپ ڈرتے ڈرتے ہوادار کھڑکی پھلانگتی ہوئی کمرے کے اندر آ گئی اور دیوار پر ٹھہر گئی۔ یہ دیوار اب ہموار نہیں ہے۔ اس کا پلاسٹر جگہ جگہ اکھڑ چکا ہے اور اس میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ یہ نرم نرم دھوپ جب اس بوسیدہ دیوار کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے تو یہ دراڑیں جیسے زخموں کا سا روپ اپنا لیتی ہیں اور یہ دھوپ بھی زخمی ہو کر رُک رُک کر ٹھہر ٹھہر کر کھڑکی سے باہر چلی جاتی ہے۔ میرے شریر اور میرے وجود کو لہولہان کر کے۔!!!

اس نے آہستہ آہستہ اپنے جسم کو بے لباس کر دیا اور میرے قریب آ گئی۔

''یہ طویل عرصہ کیسے گزارا تم نے'' اس نے پوچھا۔

''بس گذر گیا'' میں نے جواب میں کہا۔

''ناراض ہو''

''کس بات پر''

''اس لئے کہ میں نے آنے میں دیر کر دی بہت دیر''۔

''اب تم آ گئی ہو یہی کیا کم ہے''

''میرے لوٹ آنے سے خوشی نہیں ہوئی'' اس نے کریدا۔

''ہوئی ہے اور نہیں بھی''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔''

''تم شاید نہیں جانتیں کہ اس طویل مدت میں یہاں آسمان کی وسعتیں سمٹ گئیں اور دھرتی کی گود پھیلتی گئی۔

"لیکن اب میں لوٹ آئی ہوں۔"

"ہاں جانتا ہوں کہ تم لوٹ آئی ہو۔" یہ کہہ کر میں نے خاموشی اختیار کی حالانکہ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس کے جانے کے بعد میں اس قدر اکیلا ہو گیا تھا جیسے پرندوں میں سے ایک پرندہ۔!!

دھوپ ابھی تھکی نہیں تھی وہ دیوار کو اب بھی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی۔ ایک بے نشان نقطے کی تلاش میں ہم دونوں خوابوں کی طرح بکھر گئے۔ ایک دوسرے کے خیالوں میں الجھ گئے۔ ناامیدی کی مسکراہٹوں اور پُر امید دل کی دھڑکنوں میں کھو گئے۔ جہاں کچھ نہ ہو، کوئی بات نہ ہو وہاں کوئی کہانی جنم نہیں لیتی اور پھر اتنے برسوں بعد وہ تلخ سا موضوع چھیڑنے سے کیا حاصل۔ ہاں اس کے جانے کے وقت میں نے یہ ضرور کہا تھا۔

"تمہارے آنگن کی مٹی کو تمہارے قدموں کی آہٹ نہ سن کر کس قدر مایوسی ہوگی کچھ تمہیں اس کا احساس ہے۔ صبح صبح کمرے کی کھڑکی کھولتے ہی ہوا کا ایک زوردار جھونکا تمہارے چہرے کو شاداب کرنے کے لئے جب اندر آئے گا تو تمہیں نہ پاکر اس پر کیا بیتے گی۔ اس کے بارے میں تم نے کچھ سوچا بھی ہے۔ شہد کی مکھیوں کا والہانہ گیتوں کے اثر سے تمام غنچے جب پھولوں کا روپ اختیار کریں گے تو ان کی بھینی بھینی خوشبو تمہیں کہاں کہاں تلاش کرتی رہے گی۔"

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے" اس نے میری بات کو اَن سنی کرتے ہوئے پھر وہی پرانا سوال دہرایا تھا۔

"ہاں آخری اور اٹل بھی، میں مروں گا یا جیوں گا اپنے گھر میں اپنے گاؤں میں اور اپنے گاؤں والوں کے ساتھ۔"

اور اس طرح میری گل بدن میری آشارانی چلی گئی، اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ۔ اس وقت میں شاید اس کے لیے کوئی نہ تھا نہ اپنا نہ پرایا۔ شاید وہ اپنی جگہ ٹھیک تھی۔ اس لیے چلی گئی اور میں اپنی سوچوں کے دائرے سے باہر نہ نکل سکا اور اسی لیے رکا رہا اور اپنے پرانے بوسیدہ مکان کے در و دیواروں میں مقید رہا اور اپنی کھلی کھلی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ وحشت، دیوانگی خاک اور خون کی

ملاوٹ بربادی کے نظارے۔ اس نے شاید اب حقیقت کو پالیا تھا اور لوٹ آئی۔ میں شاید ابھی تک اسی دوراہے پر کھڑا تھا جہاں مجھے وہ چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ہم دونوں کو شاید اب بھی ایک دوسرے کا عکس دیکھنے کا انتظار تھا۔

''تم جانتے ہو''

''کیا''

''اب میں وہ نہیں ہوں جو پہلے تھی''

''لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ خاموش رہی

''اب کیا سوچ رہی ہو'' میں نے پوچھا

''یہی کہ تم اب بھی پہلے جیسے ہو...... بالکل ویسے ہی......''

''ہاں جانتا ہوں۔''

''کیسے'' اس نے سوال کیا۔''

''اس لیے کہ اس دوران میں نے صرف گھٹن دیکھی، بھوک دیکھی، ویرانیاں اور مجبوریاں دیکھیں۔ خون سے لت پت لاشیں دیکھیں اور.... اور..... ہم!

''اور کیا''

''اس کمرے کی بوسیدہ دیواروں پر اسی دھوپ کو بے لذت ہوتے ہوئے دیکھا۔ بے لذت دھوپ بے لذت زندگی۔ میں اب اس بے لذت دھوپ اور بے لذت زندگی کا عادی بن چکا ہوں۔''

''شاستروں میں لکھا ہے کہ اپنے آپ کو تکلیف دینا گناہ ہے۔''

''یہ کہنے کی باتیں ہیں، سچ نہیں ہے''

''پھر سچ کیا ہے؟''

''سچ یہ دھوپ ہے اور میرے وجود کا ٹھنڈا پن، میرے چاروں طرف بکھری ہوئی تنہائیاں اور تاریکیاں، سچ تو یہ ہے آشارانی کہ ان خوفناک تاریکیوں میں بھی میرے گاؤں والوں میرے بھائیوں

نے میری ہر طرح سے حفاظت کی، باہر کیا ہورہا ہے، کیوں ہورہا ہے، اس کا انہوں نے مجھے احساس تک نہ ہونے دیا۔''

''اس کا مجھے احساس ہوا''، آشارانی نے کہا..... ''یہ احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں نیا ماحول اپنا چکی تھی اور اِس نئے ماحول میں رہ کر مجھے احساس ہوا کہ ایک اور بھی سچائی ہے۔''

''کون سی سچائی؟''میں نے پوچھا۔

''اپنی مٹی اپنی مٹی ہوتی ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہوا جس وجہ سے بھی ہوا۔ کیا وہ سب صرف یہیں ہوتا ہے...... نہیں ہرگز نہیں........ یہاں سے باہر کی دنیا میں بھی دیوانگی ہے۔ بندوقیں اور گولیاں ہیں، بھوک ہے اور مجبوریاں بھی....... لیکن.......''

''لیکن گیا''

''وشال دیش کی اَن گنت بھیڑ میں یہاں سے جانے والے جس اہم اور عظیم نعمت سے محروم ہوگئے وہ ان کی شناخت ہے پہچان ہے اور وہ سب اسی شناخت اور پہچان کی تلاش میں بکھر چکے ہیں۔''

''میری گل بدن یہ تم کہہ رہی ہو۔''

''ہاں میں جو کہہ رہی ہوں وہ ایک حقیقت ہے ایک سچائی ہے۔ تپتی دھوپ میں جب انہیں اپنے چناروں کی ٹھنڈی آغوش یاد آتی ہے تو ان کی آنکھوں سے خود بخود آنسو اُمڈ آتے ہیں۔ جب پانی حاصل کرنے کے لئے انہیں نل کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا ہے تو یہاں کی جھیلیں ان کی نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔ یہ برف پوش پہاڑ، یہ ندی نالے یہ پودوں سے بھرپور باغات اب شاید ان کی تقدیر میں نہیں، ہاؤس بوٹ، ڈونگے، شکارے ان کی ساخت اور بناوٹ ان کی آنے والی نسلیں صرف کتابوں سے جان سکیں گے۔''

آشارانی بے حد جذباتی ہوگئی، اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''کہاں ملتے ہیں اُن ریگ زاروں میں وہ کشمیری نغمے جن میں شیرینی ہے نکہت ہے، نیلگوں پانی کا نور ہے، خواب آلودہ راتوں کی مہک ہے، بزرگوں کی عظمت کا اعتراف ہے!''

اس کے بعد وہ بے تحاشا رونے لگی۔ مجھے لگا جیسے محبت کی غماز آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک ایک قطرہ اس کے دل کی الجھنوں کا ترجمان ہے اور میں من ہی من میں سوچنے لگا کاش جانے والے لوٹ آتے۔ اپنی دھرتی کی گود میں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک سایہ بن کر ڈھل جائیں۔ مجھے احساس ہے کہ صبح صادق اگر چہ ابھی دور ہے لیکن تنگ راستوں پر گم نام روشنی پھیل رہی ہے۔!

کچھ کہانیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو دوسروں سے کہی نہیں جاتیں!!

دھوپ کا بدن اب میرے سامنے بے لباس پڑا ہے، حرارت اور گری سے بھر پور اور میں نے بے لباس بدن کو اپنے سینے کے ساتھ لگایا، اپنے بازوؤں میں اس سراپا کو سمیٹ لیا ایسا کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ اس کی حرارت اور گرمی میرے ٹھنڈے پن سے زیادہ قوت رکھتی ہے۔ اس نے ٹھیک تو کہا تھا کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی میں پہلے جیسا ہی ہوں۔ بالکل ویسا ہی!!

اور میں آہستہ آہستہ اپنے وجود کے ٹھنڈے پن میں پگھلتا رہا اور وہ میرے وجود کی دھوپ کی راہ ہموار کرتی گئی پھر آہستہ آہستہ دیوار کی ناہمواری ہموار ہوگئی۔ دراڑیں ختم ہوگئیں۔!

اور پھر دھوپ نے ایک لمبی انگڑائی لی اور کمرے کے ایک گوشے میں سمٹ کر کھڑکی سے باہر چلی گئی۔!!

☆☆☆☆☆

دلدل

''ایسا نہ کہو بیٹی' بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے' تم بھی صبر کرو' میری بیٹی۔۔صبر۔''!

خادمہ نے اپنی نظریں اُٹھا کر دیکھا' اُس کے ابو سامنے کھڑے تھے' بے حد اُداس اور افسردہ' اپنے ابو کو دیکھ کر خادمہ کی آنکھوں میں جیسے سیلاب آ گیا' ہونٹ کپکپانے لگے اور پھر ۔۔۔وہ بے اختیار اپنے ابو سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ابو یہ کیا ہو گیا' ہم کیوں لٹ گئے' وہ کہاں چلے گئے ہم سب کو چھوڑ کر'' ابو کی حالت خود بھی غیر ہو رہی تھی' جو ہو چکا تھا اُس پر یقین نہیں آ رہا تھا' یقین اور بے یقینی کے دوراہے پر کھڑا اُس کا وجود لرز لرز رہا تھا۔انہوں نے خادمہ کی پیٹھ پر تھپکی دی اور کمرے سے باہر نکل آئے' سامنے بستر پر دو معصوم جانیں ہر فکر سے بے نیاز میٹھی نیند سو رہی تھیں۔ وہ اُنھیں دیکھتی رہی' مسلسل دیکھتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں' پریشان اور منتشر ذہن کی کتاب کے اوراق رفتہ رفتہ اُلٹنے لگے' پہلے ہی ورق پر دلی یونیورسٹی کی تصویر کے پس منظر میں اُسے خالد نظر آیا' اُس کا کلاس فیلو جو کشمیر سے آیا تھا اور وہ خود پونے سے آئی تھی تعلیم حاصل کرنے کے دوران وہ ایک دوسرے کے قریب آئے' اُن کی محبت پروان چڑھتی رہی اور جب تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا تو انہوں نے اک دوسرے کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا' ایک دوسرے کے ساتھ جینے مرنے کا عہد کیا' وہ ازدواجی زندگی میں بندھ گئے' رخصتی کے وقت والدین نے ڈوبتی آواز میں اپنی لاڈلی بیٹی کو وداع کیا اور جب کشمیر میں اُس نے اپنے نئے گھر میں قدم رکھا تو پہلے اُسے

بڑی اُلجھن ہوئی' لوگ نئے' گھر نیا' شہر نیا' ماحول نیا لیکن رفتہ رفتہ اُس کا دل لگا کیونکہ خالد کے ساتھ ساتھ خالد کے گھر والوں نے اُسے محبت دی' پیار دیا' شفقت دی' ایک باپ کی شفقت' ایک ماں کی شفقت پا کر اُس کی زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا خالد کا باپ اب اُس کے لئے ابو بن چکا تھا اور ساسو ماں اُس کی امی' اُن دونوں نے مل کر خادمہ پر محبت کے اتنے سارے پھول نچھاور کئے کہ خادمہ اِن پھولوں کی مہک سے سرشار' شاداب اور شگفتہ ہوتی گئی۔ اب تو خالد کی خود بھی بڑی عزت تھی وہ ایک سرکاری دفتر میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہو چکا تھا۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہا' اُن دونوں کی محبت پروان چڑھتی رہی' قدرت نے اب اُنھیں دو ننھے منے پھولوں سے بھی نوازا تھا' ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔۔۔ لیکن وقت نے اچانک کروٹ بدلی' کشمیر جو کبھی اپنی سندرتا' خوبصورتی اور حُسن کے ساتھ ساتھ پیار و محبت اور آپسی بھائی چارہ کے لئے برصغیر کی تاریخ میں ایک بڑی اہمیت اور منفرد مقام کا حامل تھا' نہ جانے کیوں اور کیسے بدصورتی کے ایک ایسے دلدل میں پھنس گیا کہ یہاں کی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی' سڑکیں خون آلودہ ہونے لگیں' معصوم سینے چھلنی ہونے لگے ڈھیر سارے پھول بن کھلے ہی مرجھانے لگے' کتنے ہی اَن دیکھے خواب تعبیر کی تلاش میں ٹوٹنے لگے' ایک آگ سی لگی اور اِس آگ کی تپش میں بہت کچھ جل کر راکھ ہو گیا اس راکھ سے دھواں اُٹھا اور پوری وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اسی افراتفری کے ماحول میں ایک شام خالد دفتر سے لوٹتے ہوئے اِس دلدل میں پھنس گیا اور وہ اپنے گھر نہ پہنچ پایا دوسری صبح اُس کی کار ایک ویران سی راہ گذر پر مل گئی لیکن خالد کا کوئی پتہ نہ چل سکا وہ میٹھے میٹھے درد کے رشتے چھوڑ کر جانے کہاں چلا گیا تھا کن انجانی راہوں میں گم ہو گیا تھا اور اپنی خادمہ کے لئے صرف کچھ سہمی سہمی اُمیدیں اور کچھ اندیشے چھوڑ گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اُمید نا اُمیدی میں بدلنے لگی۔ خادمہ کا ذہن اُس کی سوچیں

بے حِس ہو کر رہ گئیں اور ایک دن اُس نے پونے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن اپنا یہ فیصلہ یہ سوچ کر خود ہی بدل ڈالا کہ وہ یہاں اکیلی نہیں ہے، کشمیر۔۔۔۔۔سارا کشمیر اُس کے دُکھ درد میں شامل ہے، اُس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو کشمیر کے آنسو میں اور پھر اِسی کشمیر میں اُس کا خالد بھی تو ہے جو نہ جانے کس بے نام قبر میں ابدی نیند سو رہا ہے، وہ اپنے خالد، اپنی محبت کو کیسے چھوڑ کر جا سکتی ہے؟ اُس کے سامنے اُس کی اپنی زندگی ہے، اپنی زندگی سے زیادہ خالد کے بچوں کی زندگی ہے، اُن کا مستقبل ہے اور یہ مستقبل اُن کے باپ کے دھرتی میں ہی پوشیدہ تھا، وہ اپنے بچوں کو باپ کی مٹی سے کیسے دور کر سکتی ہے۔

کتنے برس بیت گئے خادمہ کو یہ فیصلہ لئے ہوئے۔۔۔اب تو اُس کے بچے اسکول جانے لگے ہیں، اپنا مستقبل سنوارنے لگے ہیں اور وہ خود تن و من سے ایک ایسی تنظیم سے وابستہ ہو چکی ہے جو یتیم بچوں کو تعلیم کے نور سے آراستہ کرنے میں مصروف ہے۔۔۔یہاں آکر اُسے احساس ہو چکا ہے کہ صرف اُس کا خالد ہی نہیں بلکہ ایسے بہت سارے خالد اِس دلدل میں گم ہو چکے ہیں جن کی تلاش اب بھی جاری ہے لیکن سب بے سود، بے مقصد!

اور اب تو اُس کا ابو بھی حیات نہیں لیکن ابو کی بات اکثر اُس کے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔۔۔"بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔!!!

کہانی ایک علیا کی

''بابُو جی، آپ ایک نظر بُلبل کو دیکھ تو لیجیے۔''

میں خاموشی سے آگے چل دیا جیسے میں نے اس کی بات ہی نہ سُنی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی بے بسی چھا گئی۔ عجیب سی لاتعلقی، عجیب سی یاسیت، لیکن اُس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ تیزی سے میرے قریب آ گیا۔

''بابُو جی وہ خوبصورت ہے آپ اُسے دیکھ تو لیں۔ میری بُلبل آپ کو ضرور پسند آئے گی۔''

اب کی بار اُس کی آنکھوں میں ایک التجا تھی۔ میں نے اُسے مایوس کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اِس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ خود ہی بول اُٹھا۔

''اگر دن بھر بُلبل آپ کے ساتھ رہے گی تو کرایہ نسبتاً کم ہوگا۔''

''اچھا بھئی۔ چلو دکھاؤ کہاں ہے تمہاری بُلبل۔''

وہ خوش ہوا۔ اُس کے مُردہ چہرے پر چمک آ گئی۔ چپٹی ناک، خارش زدہ ہاتھ، پھٹے پُرانے اور میلے کپڑے اُس کی ستم زدہ زندگی کی نمائندگی کر رہے تھے۔

''بابُو جی دیکھ لیجیے بُلبل کو کتنا سفید ہے رنگ اِس کا۔''

میں نے بُلبل کی طرف دیکھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں حرکت ہوئی۔ اس کے کان پھڑ پھڑائے۔

اُس نے کہا۔ ''بابُو جی! بُلبل جیسی گھوڑی گلمرگ میں ایک ہی ہے۔ اتنی تیز رفتار گھوڑی گلمرگ میں کیا سارے کشمیر میں نہیں مل سکتی۔''

وہ بولتا رہا۔ میں سُنتا رہا اور گھبراتا رہا۔ ایک ادیب قلم کو چلانا جانتا ہے۔ بُلبل جیسی تیز رفتار

گھوڑی پر بیٹھنا میرے لئے ایک مُشکل ترین لمحہ تھا۔ معاملے کی نزاکت کو سمجھ کر میں نے گھوڑے والے سے کہا۔

''بھائی گھوڑے والے۔ تمہاری یہ تیز رفتار گھوڑی تم ہی کو مبارک ہو۔ میں پہلی بار گھوڑے کی سواری کر رہا ہوں۔ کہیں نیچے گرا دیا تو۔؟ نا بھئی نا، مجھے تمہاری بُلبل نہیں چاہیئے۔''

اُس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ مگر تیزی سے بولا۔

''بابُو جی برا نہ مانئے گا، ایک بات بتا دوں؟''

''کیا۔؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''سچ پوچھئے تو یہ گھوڑی بڑی سُست رفتار ہے۔''

''پھر ابھی تم کیا کہہ رہے تھے؟''

''بابُو جی کیا کریں پیٹ کے لئے بہانے بنانے پڑتے ہیں۔'' میں حیران ہو گیا۔ اپنے بیوی بچوں کو روٹی کا روکھا سوکھا ٹکڑا کھلانے کے لئے اپنا پیٹ پالنے کے لئے اُنہیں کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔

میں خاموشی سے بُلبل کی گردن کے ملائم بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اور اِس پر سوار ہونے کی کشمکش ہی میں تھا کہ میرے قریب ایک جیپ آ کر رُک گئی اور اس سے راج اُترا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''ارے تم کب پہنچے؟''

''بس ابھی آیا۔ تمہارا ہی منتظر تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''آؤ چلیں۔'' اُس نے کہا۔

راج نے بُلبل کی لگام کو پکڑ لیا اور کچھ کہنے بغیر اِس پر سوار ہو گیا۔ میں نے گھوڑے والے کی طرف دیکھا۔ اس کی یاسیت بھری نگاہوں میں مجھے مسرت کے فانوس پھوٹتے نظر آئے۔ بُلبل آہستہ آہستہ اپنے راستے پر چل پڑی۔ میں نے ایک کمزور سے گھوڑے کا انتخاب کیا اور اس پر سوار ہو کر راج کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟" تھوڑی دُور چل کر میں نے اسے پوچھا۔

"علیا۔۔بابُو،علیا۔۔"!

وہ ہمارے پیچھے تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ گِرتا پھسلتا، جیسے وہ بھی ایک گھوڑا ہو۔ میں نے گھوڑے کو چابُک مارا۔ وہ ذرا تیزی سے دوڑنے لگا۔ علیا کی رفتار میں بھی تیزی اور پُھرتی آ گئی۔ وہ زور زور سے سانس لینے لگا۔ میں نے گھوڑے کو ایک جگہ پر کھڑا کیا۔ راج مجھ سے آگے نکل گیا۔

"رُک جاؤ۔۔علیا۔۔" میں نے کہا۔

وہ رُک گیا اور اپنا سانس سنبھالنے لگا۔

"علیا تم تیزی سے مت دوڑو۔ لو میں بھی آہستہ چلتا ہوں۔ صاحب کو جانے دو۔"

وہ مجھے گھُور گھُور کر دیکھنے لگا۔ شاید سمجھا ہوگا میں بھی کوئی بیوقوف سیاح ہوں جو اس کے دُکھ درد کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

"بابُو جی۔۔" علیا بولا۔ "آپ جیسے سبھی تو نہیں ہوتے۔ گھوڑوں کے ساتھ اُن کی رفتار سے دوڑنا تو ہماری زندگی بن چُکی ہے اسی رفتار پر ہمارے پیٹ کا دارومدار ہے۔"

مجھے ایسے لگا جیسے یہ اُس کی زندگی کا نشیب وفراز ہو۔ جسے پار کر اُس کی کشتی حیات کنارے لگ سکتی ہے۔ شاید اس کی منزل ہو، جہاں پہنچ کر وہ اپنے شیریں خوابوں کی تعبیر دیکھ سکتا۔

بُلبل اب آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔

دفعتاً علیا کی آواز سُنائی دی۔۔ "بابُو جی۔"

"کیا ہے۔"

"بابُو جی آپ کو قسمت دیکھنی آتی ہے۔" اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

میں حیران ہو گیا۔ نہ جانے علیا کو قسمت کے اِس ہیر پھیر میں کس نے اُلجھا دیا تھا پہلی ہی نظر میں آدمی علیا کی قسمت کیا اس کے آنے والے بچوں پوتوں کا حال بتا سکتا ہے۔ مُصیبت۔ مُصیبت۔ اُس کی ہر رگ میں، خون کے ہر قطرے میں مُصیبت، طوفان، غم اور نا اُمیدی چسپاں ہے۔ اور یہی غم، یہی

مصیبت اس کی زندگی ہے۔

''ہاں علیا! میں نے تمہارے ماتھے کی لکیروں کو پڑھ لیا ہے۔ تم دوسرے جنم میں امیر بن جاؤ گے۔''

''بابُو جی یہ جنم کیا ہوتا ہے؟'' اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

''جنم۔۔مرنے کے بعد آدمی دوبارہ زندہ ہوتا ہے نا اُسے جنم کہتے ہیں۔''

''مگر بابُو جی ہم جنم ونم نہیں مانتے ہیں۔''

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''علیا تمہارے دوسرے جنم میں آنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم مر کر پھر سے زندہ ہو جاؤ گے۔ گندگی کے اِس لبادے کو پھینک کر سادہ اور صاف لبادہ پہننے میں کامیاب ہو جاؤ۔ تمہیں پیٹ بھر کر کھانا ملے۔ تمہاری بیوی بچوں کو بھوکا نہ رہنا پڑے۔ انسان ہو کر حیوان کی طرح نہ دوڑنا پڑے تو وہی تمہارا دوسرا جنم ہوگا۔۔سمجھے!''

''بابُو جی۔۔'' اُس نے کہا۔ ''پچھلے سال ایک اور بابُو جی نے ایسی ہی باتیں کی تھیں۔''

''کیا کہا تھا اُس نے؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''اُس نے میرے بیٹے سے کہا تھا کہ چند ہی روز میں وہ چھ سات گھوڑوں کا مالک بن جائے گا۔ وہ بہت امیر بن جائے گا۔ میرا بیٹا اِس قدر خوش ہوا تھا کہ اُس نے بابُو جی سے کرایہ بھی نہ لیا۔''

''اچھا۔''

''ہاں بابُو جی۔''

''پھر کیا ہوا۔ کیا وہ امیر بن گیا؟''

''بابُو جی، اُس واقعے کے چند دن بعد جب میرا بیٹا گلمرگ سے ٹنگمرگ سواری کی تلاش میں آ رہا تھا کہ گھوڑے سمیت کھڈ میں گِر کر مر گیا۔''

میں چونک پڑا۔ علیا مُسکرا رہا تھا جیسے اس کا بیٹا نہیں مرا ہو بلکہ ایک کھلونا گر کر ٹوٹ گیا ہو۔ لیکن مجھے علیا کی اس مُسکراہٹ میں ایک بھرپور طنز کی جھلک دکھائی دی اور مجھے لگا جیسے وہ اپنی بربادی پر

مُسکرا رہا ہو۔

''بابُو جی۔'' اُس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''بابُو جی ہماری زندگی کیا ہے۔اِس سڑک پر یہ بکھرے ہوئے پتھر دیکھ رہے ہیں نا آپ ۔۔۔ بے جان، بے حس اور خاموش پتھر۔بس ہم بھی یہی پتھر ہیں۔جو بھی یہاں سے گُزرتا ہے ان پتھروں کو روندتا چلا جاتا ہے۔ہماری زندگی کو روندتا چلا جاتا ہے۔کوئی نہیں سمجھتا کہ ان پتھروں میں بھی جان ہے۔ان کا بھی دل ہے، یہ بھی چیخنا چاہتے ہیں۔بابُو جی وہ زمانہ کب آئے گا جب یہ پتھر بھی چیخ سکیں گے۔روندتے ہوئے پیروں کو اپنے سے دُور رکھ سکیں گے۔ہم جانتے ہیں وہ زمانہ کبھی نہیں آئے گا، کبھی نہیں، صدیوں کو دستور تھوڑے ہی بدل سکتا ہے۔''

اور میں علیا کے بارے میں سوچنے لگا۔اُس کی خوشی، اُس کا دُکھ، جب کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تو میرا دماغ جھنجھلا گیا۔اس جھنجھلاہٹ سے بچنے کے لئے میں نے علیا سے پوچھا۔

''کیا بُلبل تمہاری ہے؟''

''نہیں تو بابُو جی۔میری گھوڑی میرے بیٹے کے ساتھ کھڈ میں گر کر مر گئی نا۔''

''او۔۔۔'' یہ سُن کر مجھے بڑا دُکھ ہوا۔

''لیکن یہ گھوڑی کس کی ہے؟''

''گھوڑوں کے بیوپاری کی ہے۔میری بیوی بیمار ہے، بہت بیمار۔دوا کے لئے کوئی پیسہ نہیں۔اُسے دوا چاہیئے۔خوراک چاہیئے۔میں غریب ہوں۔بابُو جی دوا کہاں سے لاؤں، غذا کہاں سے لاؤں۔جوان بیٹا تھا۔اپنا گھوڑا تھا۔دونوں مر گئے۔اور اب یہ گھوڑی لی ہے۔یہی بُلبل بابُو جی مالک کو روز پیسے دینے ہیں۔چاہے کچھ کماؤں یا نہ کماؤں۔کوئی خریدار ملے یا نہ ملے۔'' وہ خاموش ہو گیا۔اور پھر خود ہی بولنے لگا۔

''اُجرت دینی ہے بابُو جی، کرایہ دینا ہے۔بابُو جی میری بیوی بچ جائے گی نا؟''

''ہاں علیا تمہاری بیوی بچ جائے گی۔ضرور بچ جائے گی۔''

وہ خاموش ہوگیا اور میں سوچنے لگا۔ آخر کب تک بجھے تاروں کی چھاؤں میں یہ لوگ ٹھنڈی کو نیلوں کے خواب دیکھتے رہیں گے۔ آخر کب تک یہ لوگ جھوٹی مسکراہٹوں سے دُنیا کا ساتھ دیتے رہیں گے۔ کب تک ان کی آنکھوں میں اُداسی تیرتی رہے گی۔ کب تک؟ خُدا جانے کب ان کی زندگی بھی زندگی بن جائے گی۔ خوشحال اور شاداب زندگی۔ پھُولوں، گیتوں اور نغموں سے بھرپور زندگی جہاں بھوک نہ ہو، فاقے نہ ہوں، ننگا نہ رہنا پڑے۔ جہاں پیٹ بھر کر کھانا ملے۔

اتنے میں ہم گلمرگ پہنچ گئے۔ راج میرا انتظار کررہا تھا۔ ہم نے گھوڑے والوں سے کہا کہ واپسی پر ہمارا انتظار کریں۔ گلمرگ کے موسم کا کبھی کوئی بھروسہ نہیں۔ ابھی تپتی ہوئی دُھوپ ہے اور ابھی موسلادھار بارش۔ اِس لئے جب گلمرگ میں ہمارے پہنچتے پہنچتے بارش شروع ہوگئی تو میں حیران نہیں ہوا۔ ہم جلدی سے ٹورسٹ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ میں باہر برآمدے میں ہی بیٹھ گیا اور دُور خلاؤں میں گھوُرنے لگا۔ گلمرگ کی خوبصورتی میں کھوگیا۔ علیا کی کہانی نہ جانے میرے ذہن کے کس تاریک کونے میں گم ہوئی۔ میں وہ جگہ بھُول گیا جہاں علیا رہتا ہے۔ اس کی بیمار بیوی رہتی ہے۔ جہاں دوائی نہیں ملتی۔ جہاں زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ جہاں صرف ویران اور سیاہ راتیں راج کرتی ہیں۔ جہاں کبھی سویرا نہیں آتا۔

جہاں۔۔؟

گلمرگ کتنی خوبصورت جگہ ہے۔

''او بھئی عرفان۔۔!'' مجھے راج کی آواز سُنائی دی۔ میں مُسکرادیا۔ اور اس کی طرف بھاگ گیا۔ وہ اندر ایک اور آدمی کے ساتھ مے نوشی میں مشغول تھا۔ وہ دونوں گھوڑے والوں کی موجودہ حالت میں اُلجھ گئے تھے۔ راج کہہ رہا تھا۔ ''یار ان کی حالت جتنی نازک ہے اس سے زیادہ نازک تو اپنی حالت ہے۔ اُدھر بوڑھا باپ سانپ بن کر دولت پر چمٹ کر بیٹھا ہے۔ اِدھر میں کنگال ہورہا ہوں۔ ستر سال عمر ہے اور بیوی رکھی ہے بیس سال کی۔ حد ہوگئی شرافت کی۔ اب اُس گھر میں میری کیا گزر ہوگی جہاں ماں کی عمر بیس سال ہو۔۔۔!''

"یہ تو ٹھیک ہے۔" نوجوان بولا۔۔ "گھوڑے والوں کی حالت پتلی ہے تو ہونے دو۔ اگر جوانی میں ہم نے ان چیزوں کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تو تپ دق ہو جائے گی۔ اور میرا بھائی اِس مرض کا ڈاکٹر ہے۔ مگر اس کے پاس اس مرض کا واحد نُسخہ ہے جو مجھ پر آزمایا نہیں جا سکتا۔"

"کون سا نُسخہ بھئی۔" راج نے ایک اور پیگ اُنڈیلتے ہوئے کہا۔

"موت کا۔"

ہم سب بے ساختہ ہنس پڑے۔

اور میں سوچنے لگا۔ یہ گھوڑے والوں کی اقتصادی حالت کے متعلق باتیں کر رہے ہیں یا اپنے والدین کے متعلق! میرے ذہن میں علیا اور بُلبل کی کہانی پھر اُبھرنے لگی۔ یہ لوگ شراب پی رہے ہیں اور علیا کی بیوی دوائی کے لئے ترس رہی ہے۔ راج کی مُنہ سے شہابی رنگت کی مے چھلکتے دیکھ کر میرے سامنے علیا کی خون تُھوکتی مدقوق بیوی کی تصویر ناچنے لگی۔

میں گھبرا سا گیا اور وہاں سے بھاگ کر باہر چلا آیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" نوجوان نے پوچھا۔

"باہر جا رہا ہوں۔ بارش میں بھیگنے سے مزہ آتا ہے۔"

وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا جیسے میں والٹ ڈیزنی کا کوئی کارٹون ہوں۔ میں بالکل اِسی انداز میں مُسکرا دیا۔ اور باہر چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد راج بھی چلا آیا۔ ہم گلمرگ کی گاف لنکسِ میں دوڑتے رہے، پھسلتے رہے۔ راج کہہ رہا تھا۔ "عرفان سوچ رہا ہوں پتا جی کے مرنے کے بعد میں کیا کروں۔۔"

میں نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ یہ لڑکا کس مزے سے اپنے باپ کی موت کا تذکرہ کر رہا ہے اور اُس گھوڑے والے نے کس انداز میں اپنے بیٹے کی موت کا تذکرہ کیا تھا۔ راج کے انداز میں ایک شان ہے۔ ایک ہونے والی کامیابی کی خوشی، گھوڑے والے کے انداز میں ایک شکایت تھی۔ مستقبل برباد ہونے کی ایک کراہ تھی۔ ایک تڑپ تھی، ایک طنز تھا!

"راج کبھی سوچ سمجھ کر بھی باتیں کیا کرو۔"

"اِس میں سوچ کی کون سی بات ہے۔ وہ ہزاروں روپے اپنی جوان بیوی پر لُٹا رہا ہے اور وہ ہے کہ۔۔۔۔!"

"راج۔۔۔" میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنے جا رہا ہے۔

"میرے خوبصورت افسانہ نگار، سچائی سچائی ہے۔ تم بزدل ہو کہ اصلی بات کہتے سے ڈرتے ہو۔"

"کیوں۔۔۔!"

"اِس لئے کہ میرے سامنے میرے ہمدرد بنتے پھرتے ہو اور میرے بعد بڑی شان سے میری ماں کی باتیں کرتے ہو۔ ڈیر تم سب بُزدل ہو۔ یہاں آ کر گھوڑے والوں سے اُن کی درد بھری داستان سُن کر اُن کی مصیبتوں پر چیختے رہو گے اور پھر چند لمحے بعد اُنہیں بھول جاؤ گے۔ کیونکہ وہ بھولنے والی چیز ہے۔"

وہ مُسکرایا اور میں اپنا کردار ٹٹونے لگا۔ راج نے جو کچھ کہا وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ مجھے محسوس ہوا راج عظیم ہے۔ وہ پھر کہنے لگا۔ تم ادیب ہو ہمیشہ لوگوں کے درد اور خوشی اور دوسری چیزوں کا جائزہ لیتے ہو۔ کبھی اپنے اندر کے کردار کو بھی ٹٹولا ہے۔ ابھی گھر جا کر ان گھوڑے والوں پر ایک کہانی لکھو گے۔ اپنے اندر کے انسان کو دیکھو۔ اپنی کمزوریوں کو ٹٹولو۔ تم بذاتِ خود ایک کہانی ہو۔۔!"

"مگر آج تم یہ سب کیوں کہہ رہے ہو؟"

"اِس لئے کہ ہوٹل سے تم اُس طرح بھاگ گئے تھے جیسے ہم اِس دُنیا کی باتیں نہیں کر رہے تھے۔"

راج بولتا رہا اور میں سُنتا رہا۔۔!

راج عظیم ہے۔!!

رات کو جب راج کی جیپسی میں سری نگر آ رہے تھے تو وہ ہنس کر کہہ رہا تھا۔

''یہ سالے گھوڑے والے بڑے چالاک بنتے ہیں۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے ہوتا کیا۔ اپنے پاس پچاس روپے کا ایک جعلی نوٹ تھا۔ وہ گھوڑے والے کو دیا۔۔۔!''

میرا دماغ تیزی سے گردش کرنے لگا۔ میری نگاہوں کے سامنے علیا کی صورت پھر گئی اور مجھے ایسا لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

''بابُو جی، میری بیوی بیمار ہے، بہت بیمار ہے۔۔۔۔ دوائی کے لئے کوئی پیسہ نہیں، اسے دوا چاہئے۔۔۔خُوراک چاہئے۔۔۔۔ میں غریب ہوں۔۔۔۔ بابُو جی۔۔۔ بابُو جی؟!

☆☆☆☆☆

آسمان پھول اور لہو

وہ ایک عام سی صبح تھی اور میں اپنے معمول کے مطابق مارکیٹ میں گھریلو ضروریات کی چیزیں خریدنے میں مصروف تھی کہ کھلونوں کی ایک دوکان کے سامنے میرے قدم خود بخود رک گئے اس لئے نہیں کہ اس دکان میں مختلف انداز کی خوبصورت اور سندر سندر سی گڑیوں کی ایک دنیا آباد تھی بلکہ اس لئے کہ چھ سات سال کا ایک معصوم سا لڑکا دکان کے مالک سے ایک گڑیا خریدنے پر اصرار کر رہا تھا اس کی باتوں سے اس کے اندرونی جذبات کی تڑپ صاف نظر آ رہی تھی اس کے ایک ہاتھ میں گڑیا تھی اور دوسرے ہاتھ میں چند سکے!

"دیکھو تمہارے ہاتھ میں پڑی یہ ریزگاری میں دوبار گن چکا ہوں اس چھوٹی سی رقم سے تم یہ گڑیا خریدنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے خریدنے کی تو دوسری بات ہے۔"

پھر اس معصوم سے لڑکے نے میری طرف دیکھا اور کہا

"آنٹی کیا میں ان پیسوں سے یہ گڑیا نہیں خرید سکتا۔"

میں نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھوں سے ریزگاری لے کر گننا شروع کر دی واقعی بہت کم پیسے تھے اور اس اعتبار سے دوکاندار ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

"آنٹی میرے لئے اس گڑیا کا خریدنا بہت ضروری ہے۔"

"کیوں، ایسی کیا بات ہے۔" میں نے پوچھا۔

"یہ گڑیا میری باجی کو بہت پسند آئے گی وہ اسے پا کر خوش ہوگی بہت خوش۔"

"تمہاری بہن بھی ہے۔"

"ہاں لیکن وہ اب ہمارے ساتھ نہیں رہتی۔"

''کہاں رہتی ہے وہ''

''ابو کہتے ہیں کہ وہ آسمانوں میں چلی گئی ہے اللہ میاں کے پاس اور ابو یہ بھی کہتے ہیں کہ اماں بھی بہت جلد جانے والی ہے۔''

''کہاں: میں نے پوچھا۔

''آسمانوں میں اپنے اللہ کے پاس اور میں''........ یہ سنتے ہوئے مجھے لگا جیسے تیز تلخ اور چلچلاتی دھوپ اس کے نس نس میں اُتر چکی ہو۔

''ہاں ہاں کہو''

''میں اپنی اماں کے ہاتھوں یہ گڑیا اپنی باجی کو بھجوانا چاہتا ہوں آسمانوں میں........ لیکن.......''

''لیکن کیا''

''میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں میرے پاس زیادہ پیسے ہوتے تو میں سپید پھولوں کا گلدستہ بھی خرید لیتا اپنی اماں کے لیے..... انھیں سپید رنگ کے پھول بہت پسند ہیں۔''

میں نے محسوس کیا جیسے یہ کہتے ہوئے اس معصوم سے لڑکے کی بلوریں آنکھوں میں سارے جہاں کا درد، سارا کرب، سارے دکھ ایک ساتھ امڑ آگئے ہوں۔

''آنٹی جانتی ہیں کہ میں نے ابو سے کیا کہا۔''

''کیا کہا تھا بیٹے''

''میں نے ابو سے کہا تھا کہ اماں کو جانے نہیں دینا، میرے لوٹ آنے تک روک لینا، کیوں کہ اگر وہ میرے آنے سے پہلے ہی آسمانوں پر چلی گئی، اپنے اللہ کے پاس تو میں یہ گڑیا اپنی باجی تک کیسے پہنچا سکوں گا۔ یہ پھول اپنی اماں کو کیسے دے سکوں گا۔''

ایک جانب اس کے لہجے کی سچائی اور بے لوث لگاؤ صاف صاف جھلک رہا تھا تو دوسری جانب وہ کڑوا پن بھی عیاں تھا جو اسے اپنے ماحول اور اپنے معاشرے سے ملا تھا...... اب وہ رو رہا تھا

اور روتے رورے کہہ رہا تھا۔

''کل میں نے اللہ سے دعا مانگی تھی کہ مجھے اتنے پیسے دے کہ میں اپنی باجی کے لئے گڑیا اور اپنی ماں کے لئے پھول خرید سکوں۔لیکن اللہ نے شاید میری دعا قبول نہ کی۔''

''نہیں بیٹا ایسا نہیں کہتے اللہ سب کی سنتا ہے اور پھر تم تو اس قدر معصوم ہو پھول کی مانند۔اس نے تمہاری دعا ضرور سن لی ہوگی۔دیکھو اب تم اپنے سارے پیسے میرے پرس میں ڈال دو۔''

''ایسا کرنے سے کیا ہوگا۔اس نے سوال کیا۔

''میرے پاس جادوئی پرس ہے،تم ڈال تو دو اور پھر دیکھتے جاؤ کہ جادوئی جن کیا کرتا ہے۔''

اس نے ہاتھ میں پڑی ریزگاری میرے پرس میں ڈال دی میں نے دوکاندار کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھائی صاحب، یہ گڑیا اور پھول پیک کرا دیجئے اور مجھے بتا دیجئے کہ کل کتنے پیسے بنتے ہیں۔''

اس نے دونوں چیزیں پیک کر دیں اور کاغذ پر رقم لکھ لی میں نے پرس کھول کر دونوں کی قیمت ادا کی۔

''اب تم جا سکتے ہو،تمہاری اماں تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی،تمہارے ابو بھی تمہاری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔اور ہاں سنو اللہ نے تمہاری دعا قبول کر لی،تمہاری چیزیں تمہیں مل گئیں اور کچھ پیسے بچ بھی گئے۔یہ سنبھال لو اپنے پیسے۔''میں نے پرس کھول کر اس کی ساری ریزگاری اسے لوٹا دی۔

ایک ہاتھ میں ریزگاری اور دوسرے ہاتھ میں گڑیا اور پھولوں کا پیک لئے اس نے میری جانب اپنی بھرپور آنکھوں سے دیکھا۔

''ہاں آنٹی اللہ نے میری دعا قبول کر لی۔میں اب چلتا ہوں،اماں کے پاس ابو کہہ رہے تھے کہ اماں کے پاس بہت کم وقت ہے،وہ بھی آسمانوں میں جانے والی ہے،اللہ کے پاس........!!''

میں اسے اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک کہ وہ میری نظروں سے اُوجھل نہ ہوا!

جب جب بھی لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں نفرت، انتشار اور تشدد کی آگ بھڑکتی ہے تو خلوص اور محبت کے پھول جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ دو روز بعد میں اپنے لان میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی ایک تصویر دیکھ کر میری نظریں جم کر رہ گئیں۔ یہ تصویر ایک عورت کی تھی خون میں لت پت لہو کے رنگ میں ڈوبی ہوئی۔ اس مردہ جسم کے قریب ہی دو چیزیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ گڑیا اور سپید پھولوں کا گلدستہ، گڑیا جیسے دلہن بننے سے پہلے ہی وہ بیوہ ہو چکی تھی اور سپید سپید پھول لہو کا رنگ اپنا چکے تھے!

تصویر کے نیچے لکھا تھا!

آمنہ بی بی جو چند روز قبل اپنی بیٹی خالدہ کے ساتھ ایک شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے سرینگر سے بارامولا جا رہی تھی اور بس اسٹینڈ کے قریب ایک گرنینڈ پھٹنے کے دوران شدید زخمی ہوئی تھی کل رات زخموں کی تاب نہ لا کر اللہ کو پیاری ہو گئیں، ان کی دس سالہ بیٹی خالدہ موقع پر ہی جان بحق ہو گئی تھی........!

میں نے گھبرا کر اخبار سے اپنی نظریں ہٹا لیں، ادھر ادھر دیکھا، وہاں کچھ بھی نہ تھا، کوئی بھی نہ تھا لیکن مجھے لگا جیسے ایک معصوم سالڑکا آسمانوں کی جانب بھاگا جا رہا ہے.......!

☆☆☆☆☆

ہیلنگ ٹچ

جانے اس مختصر سی داستان کا اختتام کب ہوگا، کیسے اور کہاں ہوگا۔ جی گھبرا گیا ہے میرا، کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ سپنوں کے سہارے کب تک جیا جا سکتا ہے۔ سپنے ہمیشہ سُندر ہوتے ہیں جنگلی پھول کی طرح، خوشبو بکھیر کر مُرجھا جاتے ہیں۔ اَن جانی سوچیں میرے ذہن میں گھر بنا رہی ہیں لیکن پھر بھی سوچوں سے معمور ذہن کی بستی خالی خالی نظر آ رہی ہے۔ لگتا ہے ابھی منزل بہت دور ہے، اس منزل کی تلاش میں جن راہوں سے میرا گذر ہوا اب وہاں میرے اپنے قدموں کے نشان بھی نظر نہیں آتے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو ہر قدم پر زندگی ملتی تھی، خوبصورتی ملتی تھی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ وقت کا پہیہ رُک گیا اور مجھے زندگی کے ہر ہر قدم پر بدصورتی سے دوچار ہونا پڑا، پہلے باپ مر گیا، پھر ماں گئی۔ پیچھے تین بہنوں کا بوجھ چھوڑ گئے۔ اپنی تعلیم پوری نہ کر سکا خوبصورت مستقبل کے جو خوبصورت خواب دیکھے تھے وہ ادھورے رہ گئے۔ اپنے مستقبل سے زیادہ اپنی بہنوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُن کی پرورش، تعلیم، شادی بیاہ، ان کے زندگیاں سنوارتے سنوارتے میرے اپنے ارمان، میری اپنی خواہشیں اور چاہتیں وقت کی صلیب پر لٹک کر رہ گئیں اور جب میں نے اپنی نظریں اُٹھا کر دیکھا تو وہی پُرانا بوسیدہ مکان تھا۔ ایک چھوٹا سا مکان جس میں، میں اپنی تین معصوم بہنوں کے ساتھ رہتا تھا اور خود ایک دفتر میں ایک آڈرلی کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ تھوڑی سی تنخواہ سے گھر کے چھوٹے موٹے اخراجات پورے تو ہو سکتے تھے۔ لیکن میرے سامنے میری بہنوں کے مستقبل کا سوال بار بار اُبھر رہا تھا۔ ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دینے کے لیے، میں نے دوسرے چھوٹے موٹے کام کرنے شروع کر دیئے۔ کبھی ہاکر بن کر اخبار فروخت کرتا رہا اور کبھی کرائے پر تھری وہیلر لے کر رات گئے تک لوگوں کو اپنی اپنی منزل تک پہنچاتا رہا۔ اس طرح سے آمدنی میں قدرے اضافہ ہوا اور میں اپنی بہنوں کی تعلیم د

تربیت پر زیادہ وقت دینے لگا۔

مرتے وقت باپ نے کہا تھا۔ ''بیٹا میں تمھیں اعلیٰ تعلیم نہ دلوا سکا لیکن کوشش کرنا کہ تمھاری بہنوں کو بہتر اور اعلیٰ تعلیم حاصل ہو۔''

مجھ سے چھوٹی بہن آمنہ انگریزی ادب میں ایم۔اے کرنے کے بعد بی ایڈ بھی کر چکی ہے اور اب نوکری کی تلاش میں ہے وہ میرا ہاتھ بٹانا چاہتی ہے۔ آمنہ اپنی ایک بہن کو پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے اور اس سے چھوٹی بہن کو کمپیوٹر انجینئر مگر نوکری؟!

ایک دفتر سے دوسرے دفتر، ایک اسکول سے دوسرے اسکول، آمنہ ہر صبح گھر سے نکل جاتی ہے اور شام کو ناکام ہو کر لوٹتی ہے۔ نوکری مل جاتی، ہاں ضرور مل جاتی لیکن یہ نوکری خریدنے کے لیے اس کے پاس اور نہ میرے پاس کوئی سرمایہ ہے، نہ روپیہ پیسہ ہے، جیسے نوکری نہ ہو بازار میں بکنے والی کوئی شے ہو، پیسہ دو اور خرید کر گھر لے آؤ۔۔ لیکن ایک شام جب وہ گھر آئی تو خوش خوش نظر آ رہی تھی۔ میں نے جب اس بے وقت کی خوشی کے بارے میں جاننا چاہا تو اس نے کہا۔

آج ایک دفتر میں ایک شریف اور معزز شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اُس نے میری بات توجہ سے سُنی اور مدد کرنے کا وعدہ کیا!

یہ سن کر اس کی بہنوں کے چہروں پر گلاب کھل اُٹھے۔ اُن کی آنکھوں میں اُمید کی لہریں دوڑنے لگیں اور میں۔۔ میں بھی خوش ہوا لیکن ایک خوف، ایک انجانا سا ڈر اندر ہی اندر کروٹیں لینے لگا اور دوسرے ہی دن جب وہ اس شریف اور معزز شخص سے ملنے گئی تو جلد ہی گھر لوٹ آئی۔ وہ اُداس ضرور تھی لیکن اس کی آنکھوں سے جیسے آگ برس رہی تھی۔ لمحہ لمحہ جھلسانے والی آگ۔

''تم اتنی جلدی واپس آگئی، تم تو.....''

''ہاں بھیا، آنا ہی پڑا، دراصل اس سماج، اس سوسائٹی میں ایک بے بس اور مجبور عورت کے لیے کوئی عزت نہیں۔ کوئی وقار نہیں۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو، تم ٹھیک ہو نا۔''

''بھیا اس سے پہلے کہ وہ شریف اور مہذب انسان اپنے نقلی چہرے سے نقاب سرکاتا اور ذلالت پر اُتر آتا، میں نے اپنی سینڈل سے اس کا اُصلی چہرہ لہولہان کر دیا اور وہاں سے چلی آئی۔۔میں ٹھیک ہوں بھیا بالکل ٹھیک۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے حیا کی سُرخی اب بھی اس کے چہرے پر تیر رہی تھی۔

کشتی منجدھار میں ہو تو دونوں کناروں پر نظر رکھنا پڑتی ہے، ایک طرف میری بہن کی عزت کا سوال ہے اور دوسری طرف اس کی نوکری؟

''ارے میرے ہوتے ہوئے تمھیں کسی چیز کی کمی ہے، میں جو ہوں نا، سب دیکھ لوں گا۔ تمھیں نوکری مل جائے گی عزت کی نوکری، یہ میرا وعدہ رہا۔''

''بھیا۔۔''

'ہاں اب تمھیں کسی سے ملنے کی ضرورت نہیں، کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں بے مقصد گھر سے نکل پڑا۔

دفتر میں بالکل جی نہ لگا۔ سارا دن سوچتا رہا۔ میرے ساتھی میری خاموشی اور اُداسی کو دیکھ کر حیران تو نہ ہوئے کیوں کہ خاموشی اور اُداسی میری زندگی کا حصہ بن چکے ہیں لیکن میرے کام کرنے کے انداز میں انھیں ایک عجیب سی تبدیلی نظر آئی۔ وہ اس تبدیلی کی وجہ جاننے کی کوشش کرتے رہے لیکن میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ان دنوں صحت ٹھیک نہیں رہتی!''

کئی شب و روز ایک ساتھ گذر گئے!

رات اندھیری ہے، نہ چاند کی نرم و سبک روشنی ہے اور نہ ہی ستاروں کی چمک و دمک، ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک سیاہ بادلوں کا دھندلکا چھایا ہوا ہے، خلقت سے بھری یہ بستی خالی خالی سی نظر آتی ہے اور میں اپنے بند کمرے میں بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ اس مختصر سی داستان کا اختتام کب کہاں اور کیسے ہوگا۔ دور بہت دور گولیاں چلنے کی آوازیں سُنائی دے رہی ہیں۔ شاید کراس فائرنگ ہو رہی ہے۔۔ان آوازوں سے ان سناٹوں میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اب تو یہ سناٹے نہ صرف میری بلکہ ہم سب کی زندگیوں کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی برسوں سے جاری ہے۔ لوگ مرتے ہیں اس

جانب بھی اور اس جانب بھی کوئی وردی میں ہے اور کوئی بغیر وردی کے دونوں کے ہاتھوں میں بندوقیں ہیں۔ بندوقیں چلتی ہیں اور خون بہتا ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ خون کا رنگ ایک ہی ہے یہ خون بہتا کیوں ہے کس لیے بہتا ہے اور کس کے لیے بہتا ہے اپنے کھوکھلے وجود کی سر بلندی کے لیے اندھی تقلید کو سچ ثابت کرنے کے لیے، ایک دوسرے کے گھروں کو پھونکنے کے لیے، تہذیب وتمدن اور انسانیت کے محل پر آگ برسانے کے لیے، دھرتی حاصل کرنے کے لیے، دھرتی تو اپنی جگہ پر کھڑی ہے۔ ندی نالے حسب معمول رواں دواں ہیں، درخت بھی ہیں جو ہمیشہ کی طرح ہر موسم میں اپنا رنگ بدلتے ہیں۔ جھیل جھرنے اور پہاڑ بھی ہیں، تو یہ تباہی کس لیے۔۔ گولیوں کی آواز میں شدت آ گئی ہے، شاید یہ گولیاں، یہ بندوقیں عزت وآبرو، عصمت وعظمت اور نیکی کی دیواروں کو مسمار کرتی ہوئی آگے اور آگے بڑھ رہی ہیں۔ آواز اور بازگشت کا شور کس قدر مہیب اور بھیانک ہوتا ہے یہ کوئی ہم سے پوچھے۔ زعفران زار وادی کے لوگوں سے پوچھے۔

کل شب کی طرح آج بھی آمنہ زار زار رو رہی ہے، اس کی آنکھوں سے بارش کی طرح برستے آنسو اس کے رخساروں پر بکھر رہے ہیں۔ کاش آج اس کی ماں زندہ ہوتی تو شاید وہ اس کے آنسو پونچھ لیتی، اس کے اندر کے درد کو جاننے کی کوشش کرتی۔ اس کو اپنے سینے سے لگا کر اس کی بے آواز ہچکیوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی۔ آنکھوں میں پھیلی ہوئی یاسیت کو اپنی آنکھوں میں چھپا لیتی۔ اور آمنہ رو رہی ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ آمنہ کے پاس جا کر اسے کہہ دوں۔۔۔ ''میں تمھارے آنسوؤں کو بہتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ ایک پل بھی رنجیدہ نہیں دیکھ سکتا۔'' پر میں اسے یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ اس کے درد کی دوا میرے پاس نہیں ہے۔''

دوسرے دن صبح سویرے جب میں حسب معمول اخباروں کا ایک بنڈل لے کر گھر گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا تو مجھے حیرانی ہوئی۔ بہت سے لوگ اخبار کے لیے بے صبری سے میرا انتظار کر رہے تھے اور جب میں تھک ہار کر گھر لوٹا تو چند اخبار بکنے سے رہ گئے تھے۔ چائے پیتے سمے میں نے اخبار پر نظر ڈالی اور یہ خبر پڑھ کر اُچھل پڑا کہ ملٹینسی سے متاثر لوگوں کے لیے سرکار نے کئی اقدام اُٹھائے ہیں

اور خاص طور سے جس گھرانے کا کوئی فرد ملٹینسی کا شکار ہوا ہے اس گھرانے کے ایک فرد کو ہیلنگ ٹچ کے تحت نوکری دی جائے گی۔

ہیلنگ ٹچ، بے سہاروں کا آخری سہارا؟!

بہت دن ایک ساتھ گذر گئے!!!

اور پھر ایک دن صبح سویرے لوگوں کو اخبار کے فرنٹ پیج پر ایک ساتھ دو تصویریں دیکھ کر کوئی حیرانی نہ ہوئی۔ حیرانی شاید اس لیے نہیں کیوں کہ اب ایسی تصویریں روز ہی اخباروں کی زنیت بنتی ہیں۔ کبھی ایک روپ میں، کبھی دوسرے روپ، یہ دو تصویریں بھی کچھ ایسی نوعیت کی تھیں۔ ایک طرف آمنہ کے بڑے بھائی کی خون سے لت پت لاش تھی اور دوسری طرف سرکار کا ایک اعلیٰ آفیسر آمنہ کو ہیلنگ ٹچ کے نام پر نوکری کا حکم نامہ دے رہا تھا لیکن اس بات کی کوئی وضاحت نہ کی گئی تھی کہ آمنہ کے بھائی کو کس جانب سے گولی لگی تھی۔ کیا وہ گولی وردی میں تھی یا وردی کے بغیر اور ملٹینسی سے اس کا کیا تعلق تھا، وہ تو صرف اپنے بہنوں کا بھائی تھا۔ پھر وہ ملی ٹنٹ کب اور کیسے بنا اور کیسے ملٹینسی کا شکار ہوا۔ لیکن آمنہ اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ صرف اپنی بہن کو روزگار دلانے کے لیے اُس کے بھائی نے ایک نیا روپ اپنا لیا تھا۔۔!!!

☆☆☆☆☆

یہ شام بھی کہاں ہوئی

میں آمنہ ہوں!

چنار کے اِس کُھلے کُھلے سے درخت کی چھاؤں میں بیٹھے بیٹھے میں نے اَن گنت صبحیں اور لاتعداد شامیں گزاری ہیں، دوپہر کی تپش بھی محسوس کی ہے، اِس کی شاخوں سے کبھی زرد اور کبھی سُرخ پتے ٹوٹ ٹوٹ کر میرے بالوں پر گرتے رہے ہیں اور میں اُنھیں اپنے ہاتھوں سے سمیٹتی رہی ہوں۔ ان گرتے ہوئے زرد اور سُرخ رنگ کے چناری پتوں کی اپنی ایک کہانی ہے، یہ زرد پتے درد دیتے ہیں، دُکھ دیتے ہیں اور خزاں کے مغموم نغموں سے آشنا کرتے ہیں اور یہ سُرخ پتے میرے بالوں پر گرتے گرتے جب میری آنکھوں کو چُھو کر دھرتی پر بکھر جاتے ہیں تو میری آنکھوں میں سُرخ رنگ اُبھرنے لگتا ہے اور مجھے لگتا ہے جیسے میری آنکھیں خون کے آنسو بہا رہی ہیں، اِن آنسوؤں کی بھی اپنی ایک کہانی ہے سوچ رہی ہوں کہ یہ کہانی کہاں سے شروع کروں، گرتے ہوئے پتوں سے یا آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں سے یوں بھی تو میرا شہر کئی بار اُجڑ چکا ہے لیکن اب کی بار میرے شہر کی ہواؤں کی خوشبو دم توڑ چکی ہے، ڈل جھیل کے سینے پر بکھرے ہوئے کنول کے پتوں پر رقص کرتے ہوئے سپید سپید موتی پیاس سے بے جان ہو چکے ہیں، اِن کی پیاس بجھانے کے لئے پانی تو ہے، دریاؤں، جھیلوں، ندیوں، نالوں اور آبشاروں میں ...... لیکن مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے جیسے قوس قزح سے سُرخ رنگ کی ایک بوند گر کر اِن پانیوں کو اپنے رنگ میں رنگ چکی ہے، سپید سپید پانی سُرخ آمیز ہو چکا ہے اور اِس پانی کی مٹھاس میں ایک کڑواہٹ داخل ہو چکی ہے اب تو یہاں کی، میرے آس پاس کی زندگی ایک لفظ میں سمٹ کر رہ گئی ہے میں اس لفظ کی وضاحت نہیں کرنا چاہتی کیونکہ اب یہ لفظ لمحوں کا قیدی بند چکا ہے، اپنی ساری تمازت، حرارت اور دلکشی سے محروم ہو چکا ہے!!

میں آمنہ ہوں، لیکن میں اپنے آپ کو پہچان نہیں پاتی، میں کون ہوں؟! کیا صرف اِس کہانی کا

ایک کردار، ایک خاموش اور گونگا کردار، لیکن میری اس کہانی میں اور بھی کردار ہیں جو میری سوچوں پر دستک دے رہے ہیں، اِن کرداروں میں اسد بھی شامل ہے۔

اسد.... میرے بھائی پرویز کا دوست، اسد اپنے دوست سے ملنے بھوپال سے کشمیر آیا تھا.... اسد ایک کہانی کار، ایک قلم کار، ایک صحافی....!

اسد..... میری محبت، میری چاہت، میری زندگی کی کتاب کا خوبصورت عنوان....!

''سنو آمنہ، چنار کا یہ درخت ہماری زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے، اس کی چھاؤں میں بیٹھ کر ہم نے کتنے سارے عہد و پیمان باندھے ہیں، اس کی لمبی چوڑی شاخیں، اِن شاخوں پر نظر آنے والے لاتعداد پتے ہماری بے پناہ محبت اور ہماری ہر ہر بات کے گواہ ہیں.....!''

''رُک کیوں گئے.... کہیے نا..... آج میں آپ کی زبان سے بہت ساری باتیں سننا چاہتی ہوں، آج تو میرا افسانہ نگار اپنی کہانی سنا رہا ہے، اپنے دل کی کہانی، اپنی سوچوں کی کہانی.....اپنے چنار کی کہانی.... یہ چنار ہماری محبت کا رکھوالا ہے۔ اسد۔''

''ہاں واقعی یہ چنار ہماری محبت کا رکھوالا ہے آمنہ..... یہ ہمارے خوابوں کا چنار ہے، ہماری یادوں کا چنار ہے، کشمیر کے دلفریب بہاروں کا چنار ہے۔''

''اور یہ چنار کشمیر اور کشمیریت کی پہچان ہے۔ آ و مل کر اِس کی آبیاری کریں۔ اسد۔''

میں اسد ہوں!!

کشمیر گھومنے پھرنے آیا تھا، اپنے دوست پرویز سے ملنے آیا تھا، شاید اپنی محبت کی تلاش میں بھی آیا تھا۔ کشمیر میں مجھے یہ سب کچھ مل گیا، دوست بھی اور محبت بھی لیکن میں اِس بات سے ناآشنا تھا کہ مجھے یہاں گُھٹ گُھٹ کر مرنا پڑے گا، قلم تھامنے والے ہاتھ میں بندوق تھامنے کے الزام میں......!

''پرویز بھیا''

''کہو آمنہ''

''میں جانتی ہوں کہ آپ کے پاس اِس بندوق کا لائسنس ہے، لیکن یہاں کے بدلے ہوئے

حالات کے پیشِ نظر ہر وقت بندوق کو اپنے کندھے پر رکھنا کوئی عقل مندی نہیں۔''

''آمنہ، تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں اپنی بندوق سے صرف آکاش کی بلندیوں پر اڑنے والے پرندوں کو گرا دیتا ہوں اپنے شوق کی خاطر..,..... میرا یہ شوق میرا جنون بن چکا ہے۔''

''کیا آپ کو ان معصوم پرندوں پر بھی رحم نہیں آتا بھیا' بے زبان ہیں یہ.....''

''میں بھی کچھ کہوں پرویز''

''ہاں ہاں کہو اسد''

''جو بے رحم ہوتے ہیں وہ ہمیشہ دوسروں کی تڑپ سے ناآشنا ہوتے ہیں' ذرا اپنی بندوق مجھے دیجئے۔''

''بندوق اور تم.... تم تو قلم چلاتے ہو' میرے قلم کار دوست' بندوق چلانا تمہارے بس کی بات نہیں اسد''

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہا ہوں پرویز کہ قلم اور بندوق میں بڑا فاصلہ ہے' تمہارا کام ہے زندگی لینا اور میرا کام ہے زندگی کی حفاظت کرنا۔ میں اپنے قلم کی سیاہی سے لوگوں کو زندہ رہنے کی تحریک دیتا ہوں اور تم.... تم اپنے بندوق سے معصوم اور بے زبان پرندوں کے سینے چھلنی کر دیتے ہو۔ میں اپنے قلم سے امن و آشتی کا درس دیتا ہوں' پیار و محبت کی قندیلیں روشن کرتا ہوں اور تم..... تم اُس روشنی کو بجھا دیتے ہو.....''

''ارے تم تو بے حد جذباتی بنتے جا رہے ہو.... میں جانتا ہوں تمہارے قلم کی قوت... اس قوت کے سامنے بندوق کی قوت بے معنیٰ ہے۔ اب کیا سوچنے لگے۔''

''اور میں اب ضرور لکھوں گا پرویز.... اپنے قلم اور تمہارے بندوق کی کہانی' کشمیر کی کہانی''

میں پرویز ہوں!!!

آمنہ کا بھائی اور اسد کا دوست!

اسد نے قلم اور بندوق کے پس منظر میں کشمیر کے تعلق سے ایک طویل مضمون لکھا' یہ جانتے

ہوئے بھی کشمیر میں ہر طرف نوکدار کانٹے بچھ چکے ہیں' انسانی صورتیں دیو پیکر ہیولا میں تبدیل ہوتی جارہی ہیں' ہر طرف گھٹن ہے' خوف و ہراس ہے' دہشت کا ماحول ہے میں نے یہ مضمون ایک مقامی اخبار میں شائع ہونے کے لئے دے دیا۔ یہ مضمون شائع ہوتے ہی جیسے ایک آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا۔ ایک خطرناک زلزلہ آ گیا' ایک سیلاب آیا' اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا۔ ایک جانب وردی پوش اور دوسری جانب نقاب پوش اسد کو تلاش کرنے لگے۔ اور ایک رات بے حد پُراسرار حالات میں اسد کو میری بندوق سمیت اٹھا کر لے گئے' لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اُٹھانے والے وردی پوش تھے یا نقاب پوش!

میں آمنہ ہوں!

یہ اب سے پورے بیس برس پہلے کی بات ہے' تب سے جہلم میں بہت سارا پانی بہہ چکا ہے' چنار کا یہ درخت بھی بوڑھا ہو چکا ہے' یادوں کے کھنڈر میں تبدیل ہو چکا ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ جب صبح بیدار ہوتی ہے یا پھر رات جاگتی ہے تو میری ہی طرح اِس کے اندر کا ہر درد بھی جاگ پڑتا ہے۔ میری ہی طرح اِس کے وجود کا انگ انگ زخمی ہو چکا ہے' اِس کی ہر شاخ لمحہ لمحہ دہشت اور وحشت کی روداد بیان کرتی ہے۔ اب آپ ہی بتائے میں کس کی کہانی لکھوں اپنی' اسد کی یا اِس چنار کی..... چنار کے زرد اور سُرخ پتوں کی کہانی نہیں لکھ سکتی کیونکہ یہ پتے اب مرجھا چکے ہیں راکھ ہو چکے ہیں' اپنے آنسوؤں کی کہانی بھی نہیں لکھ سکتی کیونکہ میرے آنسو بہتے بہتے اب سوکھ چکے ہیں..... اور اسد.... میری محبت .... جانے والے شاید لوٹ کر نہیں آتے۔ اسد بھی لوٹ کر نہیں آیا۔ جانے کشمیر کی کن گھاٹیوں میں ہمیشہ کے لئے کھو گیا۔ لیکن اتنا کچھ ہونے کے باوجود میں اکثر اس بوڑھے چنار کی چھاؤں میں بیٹھ کر اِس سوچ میں ڈوبی رہتی ہوں کہ بے شمار موسموں کی مسافت طے کرنے کے بعد بھی میرے اس چنار پر بہار کب آئے گی.... کب اِس چنار کو اپنی پہچان ملے گی، کب؟!!!

سوداگر

اس قبرستان کی جغرافیائی حالت قدرے مختلف لیکن دلچسپ تھی۔ مختلف اس لحاظ سے کہ یہ قبرستان سرحد یا یوں کہیے لائن آف کنٹرول پر واقع تھا، اور دلچسپ اس لحاظ سے کہ قبرستان کا ایک حصہ اُس پار پڑتا تھا اور دوسرا اِس پار اور اس وجہ سے سرحد کے آر پار رہنے والوں کے لیے یہ مشترکہ قبرستان کا روپ اختیار کر چکا تھا۔ بہت برس قبل جب یہ ملک ایک تھا، اس کا نام ایک تھا، کوئی سرحد نہ تھی، یہ قبرستان بھی سب کے لیے ایک تھا، پھر حالات نے ایک اور رخ اپنالیا، ملک تقسیم ہوا، نام تقسیم ہوئے، لوگ تقسیم ہوگئے، سرحد وجود میں آئی، قبرستان کے درمیان بھی ایک ان دیکھی لکیر خود بخود ابھر آئی۔ ایک حصہ اُس پار والوں نے لیا اور دوسرا حصہ اس پار والوں کے لیے مخصوص کیا گیا۔ اس دوران دونوں ملکوں کے درمیان تین جنگیں ہو چکی تھیں، کون جیتا اور کون ہارا یہ تو نہ کسی نے بتایا اور نہ کبھی یہ بات ابھر کر سامنے آئی۔ امن میں لوگ جنگ کی باتیں کرتے ہیں اور جنگ کے زمانے میں یہی لوگ امن کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن اب کی بار دونوں ملکوں کے درمیان ایک ایسا سمجھوتہ ہوگیا کہ سرحد کے آر پار بندوقوں کی گھن گرج بند ہوگئی۔ سرحدیں خاموش ہوگئیں، قبرستان کی ان گنت نئی پرانی قبریں بھی خاموش ہوگئیں۔ قبرستان کی صبحیں اور شامیں تو ویسے بھی خاموش اور افسردہ ہوتی ہیں، بے حرکت اور بے حس ہوتی ہیں۔۔۔ وہ شام بھی خاموش تھی جب کسی نے یہ سنسنی خیز خبر سنائی کہ قبرستان کی کئی نئی پرانی قبروں میں شگاف پڑ گئے ہیں، اتنے بڑے بڑے شگاف کہ نیا پرانا سفید سفید کفن بھی نظر آنے لگا ہے۔ ایک کھلبلی سی مچ گئی، اِس پار بھی اور اُس پار بھی۔۔۔ پھر اصلیت جاننے کے لیے لوگ آر پار سے آئے، دونوں نے مل جل کر قبروں کو ٹھیک کیا لیکن ابھی ان قبروں کی مٹی سوکھی بھی نہ تھی کہ ایک اور افواہ پھیلی کہ رات کے دوران ان قبروں سے مرنے والوں کی روحیں نکلتی ہیں اور اپنی اپنی سرحد پار کر کے ایک

دوسرے سے ملتی رہتی ہیں۔لوگ ڈر سا محسوس کرنے لگے۔ڈر اور خوف کی وجہ سے انہوں نے قبرستان کی جانب نکلنا ہی بند کر دیا،لیکن مرنا جینا تو کسی کے بس کی بات نہیں۔موت کب کہاں اور کیسے آتی ہے یہ کوئی نہیں جانتا۔ اِس پار سے کوئی مر گیا اور لوگ اسے دفنانے کے لیے قبرستان لے آئے۔اُس پار والوں نے جب لوگوں کی ایک بڑی تعداد دیکھی تو بے خوف ہو کر وہ بھی نکل آئے۔۔اور سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بہت سی قبروں میں ایک بار پھر شگاف پڑ گئے ہیں اور کئی پرانی بوسیدہ قبریں بالکل خالی خالی نظر آرہی ہیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر لوگ پریشان ہو گئے۔ڈر گئے، سہم گئے،خوف سے لرزلرز گئے۔اُس پار والوں نے اِس پار والوں پر شک کیا۔اِس پار والے اُس پار والوں پر شبہ کرنے لگے، حالات بگڑنے لگے،دونوں طرف تناؤ کا ماحول ابھرنے لگا۔اسی وقت کسی بزرگ نے آگے بڑھ کر کہا۔

''میں آپ لوگوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں''

''کون ہیں آپ'' کسی نے پوچھا...... ''آپ کا تعلق اِدھر سے ہے یا اُدھر سے''

''میں نہ اِدھر سے ہوں اور نہ اُدھر سے...... میں دراصل قبرستان کی وہ لکیر ہوں جس نے آپ دونوں کو تقسیم کر کے رکھا ہے۔۔لیکن میری بات تو سنیئے''

''کہیے'' سب نے بہ یک زبان ہو کر کہا

''نہیں ، اس وقت نہیں ،کل دن میں اُس پار سے تین آدمی اور اِس پار سے بھی تین آدمی آئیں گے۔میں ان سب کا اسی قبرستان میں انتظار کروں گا...... کل ٹھیک دوپہر کے سمے''

اور وہ شام بھی بے حد افسردہ تھی،رُکی رُکی سی شام، دفعتاً قبرستان میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی،کوئی قبرستان کی جانب آہستہ آہستہ قدموں سے آرہا تھا پھر وہ ایک قبر کے سامنے رک گیا،قبر سے مٹی ہٹانے لگا اور جب سفید سفید کفن نظر آنے لگا تو وہ قبر کی گہرائیوں میں سے کچھ نکالنے لگا۔

''کون ہو تم'' دفعتاً وہ بزرگ اپنے چھ ساتھیوں سمیت چنار کے بوڑھے درخت کی اوٹ سے

باہر نکل آیا۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔

''کون ہو تم، تم نہیں جانتے کہ قبریں مقدس ہوتی ہیں، ان کی بے حرمتی کرنا گناہ ہے۔''

دفعتاً ایک آواز سنائی دی۔

تم لوگ مجھے نہیں جانتے، اس لیے نہیں جانتے کہ میں نہ اِس پار رہتا ہوں اور نہ اُس پار ---تیسرے ملک سے آیا ہوں، اپنے ملک کے لیے کام کر رہا ہوں اور یہ کام کرنے کے بعد مجھے روپے ملتے ہیں، ڈھیر سارے روپے!

''کیا نام ہے تمہارے ملک کا''

''ابھی تک اس ملک کا نام نہیں سمجھے؟ بے وقوف ہو تم .... میں اس ملک کے بات کر رہا ہوں جس کا واحد مقصد سارے دنیا کو اپنی مٹھی میں قید کرنا ہے---اور اب تم میرا نام جاننا چاہا گے لیکن میرا کوئی نام نہیں میں بے نام ہوں ...... نہیں میرا ایک نام ہے ...... سوداگر ...... ہڈیوں کا سوداگر۔ میں ان قبروں سے انسانی ہڈیاں نکال کر اپنے ملک لے جاتا ہوں۔ یہ ہڈیاں ان کے کس کام آتی ہیں یہ میں خود بھی نہیں جانتا اور جاننا بھی نہیں چاہتا''

''لیکن میں جانتا ہوں'' بزرگ نے کہا

''کیا جانتے ہو تم''

''یہی کہ ان ادھ کھلی قبروں کا سہارا لے کر یا بہانہ بنا کر تمہارا ملک آر پار کے لوگوں کو آپس میں لڑانا چاہتا ہے تا کہ سرحد پر خاموش بندوقیں ایک بار پھر گرجنا شروع کر دیں لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔۔کبھی نہیں ہوگا۔''

اور اس کے بعد وہ چھ لوگ جن کا تعلق آر پار سے تھا ایک ہو کر سوداگر پر ٹوٹ پڑتے ہیں!

وہ فرشتہ صورت بزرگ اب کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

مجروح قافلے کی داستان

موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی ابابیلیں نئے حوصلے اور نئے بانکپن کے ساتھ گھونسلے بنانے میں مصروف ہوگئیں، کبھی آس پاس اور کبھی دور دراز سے چن چن کر تنکے جمع کرنے کے بعد وہ تنکا تنکا جوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو نیا رنگ و روپ دینے لگیں۔ بہت دنوں کی ان تھک محنت کے بعد ان کے گھر بن گئے۔ ان کے گھونسلوں میں حرارت اور حرکت آگئی۔ زندگی کے آثار پیدا ہوگئے۔ ان گھونسلوں میں اپنائیت تھی اور ملائمت بھی اور پھر رفتہ رفتہ ان کے بے رونق زندگی میں رونق سی آگئی۔ خوشنما، خوش رنگ اور پیارے پیارے بچوں کی چہچہانے سے فضا میں موسیقی ابھرنے لگی بالکل ایسی ہی جیسے تیز رفتاری سے بہتا ہوا پانی بڑے بڑے پتھروں سے ٹکرا کر ایک پُرسوز اور پُر کیف آواز کو جنم دیتا ہے اور یہ آواز کانوں میں قطرہ قطرہ شہد گھول دیتی ہے۔

وقت کی لہریں بہتی رہیں!

اور ایک روز جب شام کے وقت ابابیلیں گھوم گھام کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئیں تو ایک موٹے باز کو دیکھ کر گھبرا گئیں۔ وہ ان کے گھروں میں جھانک رہا تھا۔!

"آپ شاید غلطی سے یہاں آگئے ہیں، یہ ہمارے گھر ہیں، ہمارے بسیرے، ہمارے آشیانے...... جی ہاں یہاں ہم سب رہتے ہیں۔" ایک ابابیل نے اُڑتے اُڑتے کہا

"تمہارے گھر تمہارے رہنے کی جگہ......"

"جی ہاں جی ہاں" اب کی بار ابابیلیں ایک ساتھ بول اٹھیں

"یہ سجے سجائے گھر اور تمہارے..... نہیں یہ صرف میرے رہنے کے قابل ہیں اور ان میں رہنے کا حق بھی میرا ہی بنتا ہے۔"

''وہ کیسے جناب''

''شاید تم اس بات سے بے خبر ہو کہ اب یہ سارا علاقہ میرا ہے، یہ بستی میری ہے یہ زمین میری ہے یہ ندی نالے دریا، جھیلیں، درخت سبزہ سب کچھ میرا ہے...... صرف میرا۔''

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے...... جب ہم یہاں آئے تھے تو یہ جگہ ویران اور اجاڑ تھی ہم سب نے مل جل کر اسے محبت محنت اور سلیقے سے سجایا سنوارا، ہماری ان تھک محنت سے ہی یہ جگہ اب گل وگلزار اور شاداب نظر آرہی ہے''

''خاموش ہو جاؤ'' باز چلا اٹھا۔

''مگر یہ ظلم ہے، زیادتی ہے''

''ظلم اور زیادتی'' باز نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا...... ''نہیں یہ نہ ظلم ہے اور نہ زیادتی بلکہ یہ ہمارا حق ہے''۔ اس نے کہا ''ہم یہاں مختار کل بن کے آئے ہیں یہاں رہنے کے لئے' یہاں ٹھہرنے کے لئے۔ یہاں سے جانے کے لئے نہیں..... جو ہمیں یہاں سے جانے کے لئے کہے گا وہ ہمارے عتاب کا شکار ہوگا..... سمجھ گئے نا.....''

''صرف تمہارے کہنے سے وقت کا پہیہ رک تو نہیں سکتا''

''بے وقوف ہو تم سب'' باز نے کہا۔ ''وقت کہ پہیہ رک بھی سکتا ہے''

''وہ کیسے'' ایک عمر رسیدہ ابابیل نے پوچھا

''تمہاری اس جنت کو کھنڈر میں تبدیل کر کے تمہارے گھروں کو مسمار کر کے''۔

''نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ تم ایسا نہیں کرو گے''..... کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔

باز اب کی بار خاموش رہا۔ اس نے اپنے دائیں بائیں دیکھا اور پھر دیکھتے دیکھتے بہت سارے باز اُڑتے اُڑتے سامنے آگئے۔ ایک عجیب سا شور وغل سنائی دینے لگا۔ ان کی آنکھوں میں دہشت تھی' بھوک تھی' ہوس تھی اور ان کی تعداد شاید ابابیلوں کی تعداد سے زیادہ تھی۔ ابابیلیں ڈر گئیں سہم گئیں لرز گئیں اور تھر تھرا گئیں۔۔۔اور پھر بھیگی بھیگی آنکھوں سے ایک ایک کر کے وہاں سے چل پڑیں'

ابدی بہاروں کی کھلکھلاتی مسرتوں کو چھوڑ کر...... اپنا سب کچھ چھوڑ کر..... نئی زمین کی تلاش میں، نئے گھر اور نئے گھونسلوں کی تلاش میں۔ وہ جانتی تھیں کہ نیا گھر بھی بنے گا، نیا گھونسلہ بھی ملے گا، پیارے پیارے بچوں کی چہچہاہٹ سے فضا میں موسیقی بھی بکھر جائے گی لیکن اگر یہ باز غاصب کا روپ اپنا کر وہاں بھی آ گئے اور ان کے آشیانوں پر شب خون مارا تو۔۔۔؟

کسی بھی ابابیل کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔۔۔!!

☆☆☆☆☆

خواب بھی بکتے ہیں

رات اب گہری ہو چکی تھی!

اور وہ پرانے بوسیدہ لباس سے اپنے بدن کو لپیٹتا ہوا کھلی سڑک کے بیچ سے گزر رہا تھا۔ کانپتا ہوا ڈگمگاتا ہوا۔ سڑک کے ایک طرف درختوں کی لمبی قطار تھی اور دوسری طرف دور دور تک پھیلے ہوئے مکان اور ان مکانوں کے درمیان ایک چھوٹی سی مسجد، مسجد کے سامنے ایک کھلا کھلا سا آنگن تھا جو جنازہ گاہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جنازہ گاہ کے ایک گوشے میں جانے کس نے سیمنٹ کا ایک چبوترہ بنایا تھا جہاں لوگ پرندوں کے لئے مکی چاول ڈالا کرتے تھے۔ اس لئے اپنی خوراک کی تلاش میں یہاں ہر وقت کافی تعداد میں اڑتے ہوئے پرندے نظر آتے تھے، ان میں کبوتروں کے تعداد اچھی خاصی ہوتی تھی۔!!

وہ جب جنازہ گاہ کے قریب پہنچا تو اس کے قدم ۔۔ ، خستہ رک گئے۔ مسجد خاموش تھی، نمازی جا چکے تھے، جنازہ گاہ میں خاموشی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لئے خالی خالی چبوترے پر بیٹھ گیا۔ زور سے کاٹتی ہوئی ہوا گزر رہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ بے حد تھک چکا ہے اور اب سونے سے ہی یہ تھکاوٹ دور ہو سکتی ہے۔ وہ سو گیا اور جب جاگا تو صبح ہو چکی تھی اور مسجد کے گنبد سے ایک آواز ابھر رہی تھی "اللہ اکبر"۔

اور پھر اسے اچانک چاروں سمیت پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں سنائی دیں۔ آسمان کی وسعتوں سے اڑتے ہوئے پرندوں کی ایک بڑی تعداد چبوترے کی جانب بڑھ رہی تھی، وہ گھبرا سا گیا اور گھبرا کر جنازہ گاہ سے باہر آیا اور سڑک کی جانب چل پڑا۔ وہ چلتا رہا اور چلتے چلتے سڑک کے آخری سرے تک جا پہنچا، جہاں بالکل نئے انداز میں لکڑیوں کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا خوبصورت سا مکان تھا،

مکان کی کھڑکی بند تھی اور دروازہ بھی لیکن دھیمی دھیمی سی روشنی کا احساس باہر سے بھی ہو رہا تھا۔ وہ رک گیا۔ یہ اس کی زندگی کا ایک سنسنی خیز لمحہ تھا۔ مکان کے دروازے پر لٹکے پرانے تختے پر نئے حروف سے 'پوسٹ آفس' لکھا تھا۔ وہ دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا، اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی لیکن لگ رہا تھا جیسے دو چار آدمی کام میں مصروف ہوں۔

''یہ خط نائب تحصیلدار کے نام ہے'' اندر سے آواز آئی۔ وہ چونک پڑا، اسے اپنے سینے میں دھک دھکی سی محسوس ہو رہی تھی، پھر اسے کئی نام سنائی دیے اور پھر ایک اور نام سنائی دیا۔ ''علی خان''۔

علی خان۔ یہ اس کا اپنا نام تھا۔ اس نے عقیدت کے ساتھ آسمان کی جانب دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ دروازے پر دستک دی۔

''پوسٹ مین صاحب''۔

''کون؟''

''میں علی خان ہوں آپ نے میرا نام پکارا، میں آیا ہوں۔''

جواب میں بے حد مذاق بھری ہنسی سنائی دی!

''صاحب، یہ ایک پاگل ہے، پانچ برس سے قریب قریب روز ہی اپنی چھٹی لینے پوسٹ آفس کے چکر کاٹتا ہے'' پوسٹ مین نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''چھٹی، کسی کی چھٹی، کہاں سے آنی ہے؟'' پوسٹ ماسٹر نے پوچھا جو حال ہی میں یہاں تعینات ہوا تھا۔

''کہاں سے آنی ہے یہ تو خود بھی نہیں جانتا، کہتے ہیں کوئی پانچ برس قبل اس کا بیٹا جانے کہاں چلا گیا، اس نے بہت تلاش کی، نہیں ملا، پھر کسی نے کہا وہ اپنے شہر سے دور کسی اور جگہ نوکری کر رہا ہے، پیسے کما رہا ہے، جب اس کے پاس کافی روپیہ پیسہ آئے گا وہ تمہیں ضرور چھٹی لکھے گا، تمہیں اپنے پاس اپنے نئے شہر بلائے گا۔''

''اور تب سے وہ اپنے بیٹے کی چھٹی کا انتظار کر رہا ہے اور ابھی تک وہ چھٹی نہیں آئی، یہی کہنا

چاہتے ہو نا تم۔'' پوسٹ ماسٹر نے سوال کیا۔

''ہاں پوسٹ ماسٹر صاحب، ابھی تک نہ تو اس کا بیٹا آیا اور نہ ہی اس کی چھٹی، اب تو تین سال سے میں بھی یہاں کام کر رہا ہوں۔ صاحب یہ پاگل ہے پاگل جانے دیجئے''۔ نیا پوسٹ ماسٹر ایک لمحے کے لئے اپنی سوچوں میں ڈوب گیا۔

''نہیں پوسٹ مین صاحب مجھے نہیں لگتا یہ پاگل ہے اس چھٹی سے اُس کے بیٹے کی زندگی کا تعلق ہے اس چھٹی سے اُس کی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ وہ خواب پوشیدہ ہیں جو اُس کے بیٹے کے مستقبل سے تعلق رکھتے ہیں۔ سہانے اور پرکشش خواب زندگی کو سجانے اور سنوارنے کے خواب۔ وہ پانچ برسوں سے اپنے ہونٹوں پر لگے زہر ہلاہل کو قند سمجھ کر اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے، تم نہیں جانتے۔ پوسٹ مین صاحب جب زندگی کی تاریکی میں مٹھاس بھرے نغمے ڈوب جاتے ہیں تو صرف ایک خلا نظر آتا ہے۔''

''صاحب آپ یہ سب کیا کہہ رہے ہیں''۔

''ہاں ہاں میں یہ سب کہا کہہ رہا ہوں، کیوں کہہ رہا ہوں کس کے لئے کہہ رہا ہوں۔ اچھا تم ساری ڈاک چھانٹ چکے نا۔ تم اب جاؤ۔ ڈاک بانٹ آؤ، یہاں کے باقی کام میں خود دیکھ لوں گا۔''

اور پھر ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی!

گزشتہ پانچ برس سے علی خان کو اپنے بیٹے کے بارے میں کوئی جانکاری نہ ملی تھی۔ شروع شروع میں اسے بتایا گیا کہ اس کے بیٹے کو فوج میں نوکری مل گئی ہے۔ اور وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شہر سے دور چلا گیا ہے لیکن اس کی غلط فہمی جلد ہی دور ہو گئی، کسی اور نے بتایا کہ اس نے اس کے بیٹے کو ایک سپید رنگ کی جپسی میں دیکھا، اس کی کلائیوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔

''سپید جپسی...... میرا بیٹا...... ہتھکڑیاں......؟'' وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ تو اپنے بیٹے کی ہر حرکت سے واقف تھا وہ جانتا تھا کہ اس کے بیٹے کے جسم کے ایک ایک انگ میں شرافت کا خون گردش کر رہا ہے، وہ بُرا ہو ہی نہیں سکتا۔ برائی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ سپید گلاب کی طرح

بے داغ ہے۔اس روز وہ دل کھول کر رویا،ان آنسوؤں میں پیار تھا، جدائی کا غم تھا!!

اور ایک شام مسجد کے امام نے علی خان کو بتایا..... ''صبر کرو میرے بھائی، صبر کا انجام ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔تمہارا بیٹا ایک دن ضرور آئے گا، وہ شاید اس شہر میں نہیں ہے، لیکن وہ ضرور لوٹ آئے گا تمہارے لئے تم سے ملنے کے لئے....... صبر کرو میرے بھائی....... ''!

''کب آئے گا میرا بیٹا مولوی صاحب۔''

''انتظار کرو علی خان....... آنے سے پہلے وہ تمہیں ضرور چھٹی لکھے گا'' اور اس دن کے بعد وہ اپنے بیٹے کی چھٹی کا انتظار کرنے لگا..... ''!!

پانچ سال کا طویل عرصہ........ اس دوران یہ جنت دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ رک رک کر ایک نیا روپ اختیار کرتی گئی۔جہنم کا روپ....... آگ، شعلے، قتل و غارت، آبروریزی، ناانصافی....... اور پھر ایک عجیب سی بات ہوئی، اچانک بہت سے نوجوان لاپتہ ہو گئے، تلاشِ بسیار کے بعد بھی ان کے بارے میں کوئی جانکاری نہ ملی، پھر ایک ہنگامہ ہوا، لوگ متحرک ہو گئے اور حراستی ہلاکتوں کیخلاف سڑکوں پر آ گئے، تلاش شروع ہوئی، کئی بے نام قبروں کی نشاندہی کی گئی اور کئی مسخ شدہ بے نام لاشیں ان قبروں سے برآمد کی گئیں.......!

ایک بار علی خان آٹھ دن تک پوسٹ آفس نہیں آیا، پوسٹ آفس میں علی خان کے جذبات کو سمجھنے اور اس کے ساتھ ہمدردی کرنے کے وسیع القلبی کسی نے بھی نہ دکھائی، لیکن وہ کیوں نہیں آیا یہ جاننے کے سبھی خواہاں تھے۔پھر آٹھ دن بعد علی خان پوسٹ آفس آیا لیکن اس روز وہ ٹوٹ چکا تھا، ہانپ رہا تھا۔اس کے چہرے سے زندگی کی شام کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

''پوسٹ ماسٹر صاحب میرے بیٹے کی چھٹی آئی کیا۔میرا نام علی خان ہے۔''

''نہیں ابھی تک تو نہیں آئی، آئے گی تو میں رکھ لوں گا'' پوسٹ ماسٹر نے نرم لہجے میں کہا۔

''لیکن آپ سے ایک التجا ہے''

''ہاں ہاں کہو بھائی''

میری چھٹی جب بھی آئے گی تو آپ کو خود آنا ہوگا''

''کہاں؟''

''میری قبر پر''

''کیا؟''

''سچ کہتا ہوں، اب میری زندگی کی آخری سانسیں چل رہی ہیں، اب میری آنکھیں یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتیں......... بھلا یہ قتل و غارت، یہ لوٹ مار، آگ برساتی بندوقیں، جھلسی ہوئی بے کفن لاشیں۔نہیں دیکھ سکتا میں یہ سب کچھ۔میری چھٹی جب بھی آئے گی، مجھ تک پہنچا دینا ورنہ قیامت کے روز آپ کے سامنے کھڑا ہو کر آپ سے سوال کروں گا۔''

اس کے بعد علی خان دکھائی نہ دیا، اس کو تلاش کرنے کی فرصت پوسٹ آفس والوں کو کہاں تھی اور ضرورت بھی کیا تھی، ان کے لئے تو وہ ایک عام سا شہری تھا۔

اس روز پوسٹ ماسٹر صاحب اداس تھے۔ان کا بیٹا بیمار تھا، کئی روز سے گھر سے کوئی خط نہ آیا تھا، گھر جا بھی نہیں سکتے تھے۔ڈاک آئی خطوط کا انبار لگ گیا۔ایک خط پر اس کی نظریں اٹک کر رہ گئیں۔ یہ خط علی خان کے نام تھا!!

''پوسٹ مین صاحب'' انہوں نے آواز دی۔

''جی صاحب''

''یہ علی خان آج کل کہاں ہیں''

''نہیں جانتا صاحب، پتہ کرنا پڑے گا''

''ہاں ہاں جا کر پتہ کرو اس کے نام خط آیا ہے، شاید اس کے بیٹے کا خط ہے۔بہت انتظار کیا تھا اس نے اس خط کے لئے...... جاؤ بھائی اور علی خان کو پوسٹ آفس لے آؤ''۔

اس روز پوسٹ مین لوٹ کر نہیں آیا۔

دوسرے دن جب پوسٹ مین پوسٹ آفس آیا، وہ اکیلا نہ تھا چند اور بھی لوگ اس کے ہمراہ

نھے۔

''صاحب، علی خان اب اس دنیا میں نہیں، اب یہ لوگ آئے ہیں اس کے نام کا خط لینا چاہتے ہیں، علی خان کی وصیت پوری کرنا چاہتے ہیں......... یہ لوگ اس خط کو اس کی قبر تک پہنچانا چاہتے ہیں۔''

اب کی بار پوسٹ مین کے لہجے سے بھی اداسی جھلک رہی تھی۔

''پوسٹ ماسٹر صاحب، کیا لکھا ہے اس خط میں، آپ بتا سکتے ہیں''۔ کسی نے پوچھا۔

''ہاں بتا سکتا ہوں لیکن لفافہ چاک کرنا پڑے گا۔''

''لفافہ کھول دیجئے'' کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔ پوسٹ ماسٹر نے لفافہ کھولا اور خط پڑھنے لگا، آہستہ آہستہ.........   کسی کو کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ پھر اچانک اس کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔ اور پھر پوسٹ ماسٹر اونچی آواز میں روتے روتے خط پڑھنے لگا۔

''جناب علی خان صاحب!

ہمیں یہ خبر دیتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کہ آپ کا بیٹا سلطا خان اب سے پانچ برس قبل لاپتہ ہو گیا تھا۔ وہ دراصل اغوا کیا گیا تھا اور پھر اسے ملی ٹنٹ کا روپ اور نام دے کر ایک فرضی جھڑپ میں قتل کر دیا گیا۔ ایک بے نام قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ عوامی دباؤ کے پیش نظر ان بے نام قبروں اور قبرستانوں کی نشاندہی کا کام شروع کر دیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں سلطان کے بارے میں تحقیقات مکمل ہو چکی ہیں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ایک معصوم اور بے گناہ شہری تھا۔ ان لوگوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے جنہوں نے پہلے سلطان کو حراست میں لے لیا پھر ملی ٹنٹ کا نام اور روپ دے کر ابدی نیند سلا دیا اور اپنے لئے انعامات اور ترقیاں حاصل کیں۔ نشاندہی مکمل ہوتے ہی ان لوگوں کے خلاف قانونی کاروائی عمل میں لائی جائے گی، لیکن ہم آپ کے بیٹے کو واپس نہیں لا سکتے اس لئے سرکار نے آپ کے حق میں ایک لاکھ روپے کا معاوضہ منظور کیا ہے اور ایک لاکھ روپے کا چیک منسلک ہے.........''

یہ سب سنانے کے بعد پوسٹ ماسٹر بے تحاشا رونے لگ گیا اور روتے روتے کہنے لگے۔''

اپنے اس شہر میں تو خواب بھی بکتے ہیں۔ اُف یہ خوابوں کے سوداگر؟''   ☆☆☆☆☆

آگے خاموشی ہے

جب ناداری اور مفلسی کے پتھریلے ہاتھ سر پر چھتری کی طرح پھیل جاتے ہیں تب سارے انسانی رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں اور آج سب کچھ بکھرنے کے بعد اُسے اپنے وجود کے اندر جھانک کر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زندگی کے بے رحم ہاتھوں میں بے بس ہو چکا ہے اور شاید اُس کی بے بسی کی اب کوئی حد نہیں، کوئی سیما نہیں اور جب کوئی شے حد سے گذر جاتی ہے تو ایک اَن دیکھے روگ کا روپ اپنا کر بے علاج ہو جاتی ہے۔

بے کاری مفلسی کو جنم دیتی ہے اور مفلسی زندگی کی سانسوں کو مختصر کر کے موت کے قریب لاتی ہے۔ اور موت..... ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھوں کو بند کرنا، اپنے دل کی دھڑکنوں کو سمیٹ لینا اور اپنی سوچوں کے دائرے کو مختصر کرنا....... اور خودکشی....... اس کے لئے ہمت چاہیے، جُرت چاہیے لیکن مرنے کے بعد اس گھر کا کیا ہوگا جہاں اُس نے اپنی زندگی کے پچیس سرما گرما دیکھے تھے جب اُس کا باپ مرا تھا تب سب کی طرح اُس نے سوچا تھا کہ اب گھر کا کیا ہوگا، مکینوں کا کیا ہوگا، خاندان کا کیا ہوگا لیکن کچھ بھی نہ ہوا نہ گھر کے اندر اور نہ ہی گھر سے باہر، گھر کے اندر چند چیخیں اُبھریں اور اُبھر کر ڈوب گئیں۔ آنکھوں میں رُکے پڑے آنسو خود بخود خشک ہو گئے اور گھر سے باہر بھی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ کسی بھی تبدیلی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ کیا ایک فرد کے مرنے سے واقعی کوئی تبدیلی رونما ہو سکتی ہے۔ نہیں...... شاید نہیں؟

"لیکن میرا باپ کافی دیر بیمار رہا اور پھر مر گیا، ایک عام سی بیماری اور ایک عام سی موت۔" وہ سوچنے لگا۔ "لیکن میں تو خودکشی کر رہا ہوں، خود ہی اپنے آپ کو مار رہا ہوں، خود ہی اپنے وجود کو فنا کر رہا ہوں، ہاں خودکشی...... گلے میں رسی ڈال کر چھت سے لٹکتے ہوئے پنکھے سے اِس رسی کو الجھا کر۔

میرے پیروں کے نیچے ایک اسٹول ہوگا اور میرے سر کے اوپر چھت، درمیان میں لٹکا ہوگا میرا بے حس اور بے جان جسم........!"

وہ ابھی ابھی اس کمرے میں آیا تھا، کمرے کے دروازہ بند کرنے سے پہلے ماں کو الوداع کہا تھا جو چھوٹے سے آنگن کے ایک گوشے میں کپڑے دھونے میں مشغول تھی، پھر اپنی اکلوتی بہن زینب کو دیکھا جو ماں کے قریب فرش پر بیٹھی ہاتھ میں سوئی دھاگا لیے کسی پرانے کپڑے کی مرمت کر رہی تھی، اس ایک لمحے میں اُس نے باہر کا دروازہ پھلانگ کر اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور ہمسائیوں کو الوداع کہا، پھر اُس نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

وہ نارمل انداز میں نیم تاریک کمرے کے درمیان رکھے اسٹول کی جانب بڑھا اور اُس پر چڑھ گیا، اسٹول ذرا ہلا، اُس نے گھبراہٹ میں چھت سے لٹکے پنکھے کا سہارا لیا اور گرتے گرتے بچ گیا۔

"مجھے اسٹول کو کوئی سپورٹ دینی چاہیئے ورنہ میرے بوجھ سے یہ دوبارہ ہل سکتا ہے۔ سپورٹ مگر کس سے اور کیوں۔" وہ پھر سوچنے لگا۔ "جب مرنا ہی ہے تو سپورٹ کیوں؟ میں تو پاپا کے مرنے کے بعد بے حد چاہت کے باوجود کسی کی سپورٹ نہ بن سکا، چاچا اور چاچی نے بھی کوئی مدد نہ کی، کوئی سپورٹ نہ دی، اپنے سالے کے میٹرک پاس بیٹے کو اچھی خاصی سرکاری نوکری دلوادی جب کہ میں نے الیکٹرانکس میں ڈگری حاصل کر لی ہے، وہ میرے لیے بھی کچھ کر سکتے تھے۔ کافی جان پہچان ہے اُن کی، سیاسی لوگوں سے ملنا جلنا ہے، اُن کی زندگی اور اُن کے گھر میں ہر آسائش میسر ہے، چند روز قبل چاچی چار قدموں کا فاصلہ طے کر کے ملنے آئی تھی اور جاتے جاتے کہنے لگی۔ "بیٹا یہ تین سو روپے رکھ لو اب مجھ سے تم لوگوں کی ناداری دیکھی نہیں جا سکتی، پھر کبھی آ کر کچھ اور دے جاؤں گی۔" اُس نے روپیہ لینے سے انکار کیا تھا۔ "چاچی ہم غریب ضرور ہیں لیکن فقیر نہیں۔"

اور اُس کے بعد اُس نے نوکری کی تلاش میں اپنی رفتار اور تیز کر دی لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ رفتار تیز کرنے سے ملازمتیں نہیں ملتیں۔ نوکریاں تو سفارش کے بے اختیار پیسے سے بندھی ہوتی ہیں۔ جہاں پہنچنا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔

''میں تھک گیا ہوں بے حد تھک گیا ہوں انٹرویوز دیتے دیتے۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے پھندا اپنے گلے میں ڈال دیا، اُس نے آخری مرتبہ بند کمرے کے کنوئیں میں زندگی سے بھرپور ایک مضبوط اور صحت مند قہقہہ لگانا چاہا اپنی تمام ناکامیوں اور مایوسیوں کو بھلا کر لیکن وہ ایسا نہ کرسکا۔ صرف کمرے کی نیم تاریکی میں ہلکی ہلکی سسکیاں ڈوب گئیں، اُسے لگا جیسے یہ کمرہ نہیں بلکہ کوئی پھانسی گھر ہو جہاں ہر خواہش ذبح کردی جاتی ہے، سولی پر لٹکائی جاتی ہے۔

اچانک اُسے خیال آیا۔ ''میری موت کے بعد اس گھر کا کیا ہوگا۔'' یہ سوچ کر وہ لمحہ بھر کے لئے کانپ گیا، اُس کے آنکھوں کے سامنے اُس کے پاپا کی موت کا منظر گھوم گیا۔

''پھر۔''

''پھر بہن کے سارے آنسو خشک ہو جائیں گے، خشک گلے میں صرف چیخیں رہ جائیں گی، پھٹی پھٹی چیخیں اور سوکھ جانے والے آنسوؤں سے اُس کے رخساروں پر نمک جم کر رہ جائے گا۔''

''اور ماں۔ وہ اپنے ہونٹ ایک دوسرے سے پیوست کر کے چپ چاپ آنسو بہاتی رہے گی!''

اُس کی سوچوں نے ایک کروٹ لی۔ مجھے مرنا چاہیے، نہیں مجھے جینا چاہیے۔'' مرنے اور جینے کی کشمکش میں وہ کئی لمحے اُلجھا رہا کہ اچانک کسی نے زور سے اُس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا، وہ چونک پڑا۔

''بھیّا دروازہ کھول دو، بھونچال آرہا ہے، فوراً نیچے چلے آؤ، بھیّا سن رہے ہو نا..... یہاں خطرہ ہے۔'' بہن کی آواز سنتے ہی اُسے لگا جیسے اسٹول خود ہی زور زور سے ہل رہا ہو اُس نے اپنے جسم کو بیلنس کرنا چاہا، اُس نے پنکھے کو دونوں ہاتھوں سے تھاما، دوسرے ہی لمحے وہ پنکھا سمیت کمرے کے فرش پر گر پڑا۔

بھونچال رُک گیا تھا، اپنے گلے سے رسی نکالنے میں اُسے ذرا بھی دیر نہ لگی۔

''میں بزدل سہی لیکن میں اب زندہ رہوں گا، ایک نئے ولولے، ایک نئے جذبے کے ساتھ

زندہ رہوں گا اپنی ماں اور اپنی بہن کے لیے۔ اس گھر کے لیے، میں نہ رہوں گا تو میری بہن کے سپنوں میں رنگ کون بھرے گا، میری ماں کے ان دیکھے خوابوں کی تعبیر کون تلاش کرے گا اس گھر اور اس کے مکینوں کو کون سہارا دے گا۔"

رُک رُک کر، جُھک جُھک کر وہ دروازے کی جانب بڑھا اور دروازہ کھول دیا۔

"زینب کہاں ہو تم۔ ماں کہاں ہو تم....... دیکھو زلزلہ رُک گیا ہے۔ میں آ رہا ہوں....... پر تم سب کہاں ہو، بولتے کیوں نہیں۔ اُف کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے....... روشنی بھی چلی گئی ہے اور آگے خاموشی ہے۔؟"

چلاّتے چلاّتے وہ آنگن کی جانب بڑھا، وہاں گلی کی اَدھ پکی دیوار گر چکی تھی اور ملبے کے نیچے دو لاشیں تھیں، ایک اُس کی بہن کی اور دوسری اُس کی ماں کی...... اور اُس سے آگے خاموشی؟

"اب اس گھر کا کیا ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے وہ بے تحاشہ رونے لگا۔

☆☆☆☆☆

(بھونچال کشمیر 2005 کی نذر)

بے زمینی کا کرب

گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر، پڑھنا لکھنا اور شام اُترنے سے پہلے کچھ دیر کے لئے ساتھ والے پارک میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کرکٹ یا فٹ بال کھیلنا اور پھر گھر آ کر ہوم ورک کرنا، ایک آدھ گھنٹہ ٹی وی کے سامنے بیٹھنا اور ہر ہر منٹ کے بعد ریموٹ کا بٹن دباتے رہنا اور پھر رات کا کھانا کھا کر سو جانا امجد کے شب و روز کا معمول تھا اور اس کے معصوم سی زندگی کا مختصر سا اثاثہ بھی۔۔ امجد دسویں جماعت کا طالب علم تھا اور اس کی عمر سولہ سال کے قریب قریب تھی۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا، ان کی شادی کے دس برس بعد بہت علاج و معالجہ منتوں اور دعاؤں کے بعد وہ اب چراغ بن کر ان کی زندگی کو روشن کر رہا تھا۔ اس کا شمار اسکول کے ذہین ترین طلبا میں ہوتا تھا۔ وہ نہ صرف کھیل کود میں حصہ لیتا تھا بلکہ اسکول کے مختلف تمدنی اور تعلیمی پروگراموں میں بھی بڑھ چڑھ کر شرکت کرتا تھا اور اس تعلق سے وہ اپنے اساتذہ میں کافی مقبول تھا اور اسکول میں اس کی دوستی کا حلقہ بھی وسیع تھا!!

لیکن وہ اس کی زندگی کا پہلا حیران کن اور اَن دیکھا تجربہ تھا۔ اس روز وہ جب حسب معمول اسکول سے لوٹ رہا تھا کہ اپنے محلے کی گلی کے نکڑ پر چند وردی پوشوں کو دیکھا جو راہ چلتے لوگوں سے پوچھ تاچھ کرتے جا رہے تھے اور کسی کسی کی جامہ تلاشی بھی لے رہے تھے، وہ جب گلی کے قریب پہنچا تو ایک وردی پوش نے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کے لیے کہا وہ رک گیا اور وردی پوش کے قریب آیا۔

"کہاں سے آ رہے ہو" اس نے پوچھا

"اسکول سے" امجد نے جواب دیا

"بیگ میں کیا ہے؟" اس نے پھر سوال کیا

''کتابیں ہیں''

''کچھ اور بھی ہوگا''

''نہیں تو۔صرف کتابیں ہیں''امجد نے معصوم لہجے میں جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے، پستول۔۔گولہ بارود؟''

پستول کا نام امجد کے لئے نیا نہیں تھا۔ اکثر کسی بڑے تہوار پر بازار سے بچوں کے نقلی پستول خریدے تھے لیکن گولہ بارود۔۔اس نام سے وہ ناآشنا تھا۔

''یہ گولہ بارود کیا ہوتا ہے''امجد نے پوچھا

وردی پوش نے کوئی جواب نہ دیا ور ہاتھ کے اشارے سے وہاں سے جانے کے لیے کہہ دیا۔

جاتے جاتے وردی پوش کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی''دہشت گرد کی اولاد۔!''

یہ آواز سن کر وہ رک گیا اور مڑ کر دیکھا۔ وردی پوش اب کسی دوسرے شخص کی جامہ تلاشی لے رہا تھا۔

''یہ دہشت گرد کیا ہوتا ہے''اس نے من ہی من سوچا۔

اور جب گھر جا کر اپنی یہ ساری داستان اپنے ممی ڈیڈی کو سنائی تو وہ ایک لمحے کے لئے حیران ہو گئے اور پریشان بھی لیکن خاموش رہے، خوف و ڈر کے تاثرات ان کی آنکھوں میں عیاں تھے۔اس شام انہوں نے امجد کو باہر جانے سے روک لیا۔!! چند روز بے عنواں گذر گئے، ایک صبح مسجد سے آواز آئی۔مسجد سے اعلان ہو رہا تھا کہ سارے مرد گھروں سے باہر آ کر سامنے کے پارک میں جمع ہو جائیں البتہ عورتوں کو گھروں میں رہنے کی اجازت ہے۔امجد نے کھڑکی سے باہر پارک کی جانب دیکھا۔آس پاس کے سارے مرد پارک میں جمع ہو رہے تھے۔ پارک کو وردی پوشوں نے گھیر رکھا تھا۔ان کی جامہ تلاشی شروع ہوگئی۔ کچھ لوگوں کو جامہ تلاشی اور پوچھ تاچھ کے بعد جانے دیا گیا البتہ چند ایک کو روک کر سامنے کھڑی سفید جیپسی کے سامنے سے گذرنا پڑ رہا تھا۔ان میں اس کا ڈیڈی بھی شامل تھا۔

اور ایک رات جب وہ کھانا کھا رہے تھے دور سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر ایک

زوردار دھماکہ ہوا۔ اور پھر ایک پراسرار خاموشی چھا گئی۔ امجد زندگی میں پہلی بار اس صورت حال سے آشنا ہونے کی کوشش کررہا تھا اور اپنے ڈیڈی سے جاننے کی کوشش کررہا تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے، کون کررہا ہے اور کیوں کررہا ہے۔ لیکن ڈیڈی اس کی سنی کو ان سنی کرتا گیا اور کمرے کی کھڑکیاں بند کیں اور پردے گرا دیے۔

اس رات امجد بھی ڈیڈی کی خواب گاہ میں سو گیا حالانکہ وہ اپنے کمرے میں سونا چاہتا تھا لیکن اپنی ممی کی ضد کے سامنے اسے جھکنا ہی پڑا۔

اور اب گولہ بارود، فائرنگ، دھماکے، تلاشیاں، گرفتاریاں اور کریک ڈاؤن۔ یہاں کی زندگی کا ایک حصہ بن چکے تھے، کریک ڈاؤن کے دوران امجد کو بھی کئی بار پارک میں دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونا پڑا۔ کئی کئی گھنٹے رکنا پڑا۔ اسکول بند رہنے لگے تعلیمی ماحول بگڑنے لگا، ہڑتالیں ہونے لگیں جلسے جلوسوں میں نعروں کی آوازیں گونجنے لگیں اور وقت کا پہیہ گھومتا رہا، چلتا رہا، کبھی تیزی اور کبھی سبک روی کے ساتھ۔ جانے کس منزل کی تلاش میں؟

اور وہ صبح منحوس روشنیوں کے ساتھ طلوع ہوئی، محلے کے سارے لوگ پارک میں جمع ہو چکے تھے۔ امجد بھی اپنے ڈیڈی کے ساتھ کھڑا تھا۔ جب سفید جپسی کے سامنے سے امجد کا گذر ہوا تو نہ جانے کیا ہوا اور کہاں سے اشارہ ہوا کہ چند وردی پوش تیز تیز قدموں سے امجد کی جانب بھاگے اور اسے دبوچ کر جپسی کی جانب لے گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر لوگ آگے آنے لگے لیکن وردی پوشوں نے اپنے ہتھیار سنبھال کر انہیں روک لیا لیکن امجد کا ڈیڈی اپنے بیٹے تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ وہ چلانے لگا۔

"یہ بے قصور ہے، کم سن ہے، اُسے کیوں لے جا رہے ہو، کہاں لے جا رہے ہو"

لیکن جپسی امجد کو لے کر نکل چکی تھی!!

وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک آفیسر سے دوسرے آفیسر، ایک پولیس تھانے سے دوسرے پولیس تھانے تک بھاگتا رہا اپنے بیٹے کی تلاش میں لیکن بیٹا نہ ملا، یہاں تک کہ گمشدگی کے بارے میں

بھی کوئی ایف آئی درج نہیں کیا گیا سب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا حالانکہ وردی پوش سینکڑوں افراد کے سامنے امجد کو اٹھا کر لے گئے اور ایک دن جب وہ ان وردی پوشوں کے کیمپ میں جو امجد کو جپسی میں اٹھا کر لے گئے تھے پہنچنے میں کامیاب ہوا تو اسے بتایا گیا کہ جن لوگوں کو مزید پوچھ تاچھ کے لئے روک لیا گیا تھا وہ کب کے رہا کیے جا چکے ہیں۔

''تو میرا بیٹا امجد کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا

''ہمارے پاس نہیں ہے، وہ کہاں ہے ہم نہیں جانتے اسے تلاش کرنا اب تمہارا کام ہے ہمارا نہیں۔!

اب کی بار امجد کی گم شدگی کے بارے میں ایف آئی آر درج تو کی گئی لیکن ایسا کرنے سے نہ تو امجد ملا نہ امجد کی لاش اور نہ ہی اس کے بے نام قبر۔!

یہ اب سے دس برس پرانی بات ہے اور آج دس برس گزرنے کے بعد موت وحیات کی کشمکش کے درمیان میں پرتاپ پارک کے ایک گوشے میں بیٹھا امجد کی کہانی لکھ رہا ہوں۔ اس کی داستان حیات کا آخری باب جو قریب ہو کر بھی دور اور دور ہو کر بھی قریب ہے۔ لیکن یہ صرف امجد کی کہانی نہیں ہے بلکہ ایسے ہزاروں معصوم بے گناہ امجدوں کی کہانی ہے جو کل تک ہمارے ساتھ تھے، ہمارے آس پاس تھے، ہمارے درمیان تھے۔۔ زندہ جاوید لیکن آج۔۔ آج وہ تصویروں میں سمٹ کر رہ گئے ہیں میرے سامنے بہت سارے مرد اور عورتیں اپنے ہاتھوں میں تصویریں لیے پرتاپ پارک میں سراپا احتجاج ہیں۔ میں سب کو دیکھ رہا ہوں، قریب سے دیکھ رہا ہوں امجد کے ڈیڈی اور ممی بھی ہیں، بے حد اداس، غمگین کمزور اور لاچار۔ لیکن یہاں تو سارے چہرے اداس اور افسردہ ہیں، سب ٹوٹ چکے ہیں، بکھر چکے ہیں۔ امجد کے ڈیڈی ممی کے ہاتھوں میں امجد کی ایک بڑی سی تصویر لٹک رہی ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے اسکول یونیفارم میں امجد اس تصویر میں بہت ہی خوبصورت لگ رہا ہے۔ تصویر کے ساتھ ہی پس منظر میں ایک چھوٹا سا بورڈ آویزاں ہے۔ جس پر لکھا ہے۔ ''ہمیں اپنا لخت جگر لوٹا دو ظالمو!!!!''

☆☆☆☆☆

سُرخ لبستی

میں جہاں اِس پُل پر کھڑی ہوں میرے ٹھیک نیچے دریائے جہلم بہہ رہا ہے' میرے آنے سے پہلے اس میں جو طوفان آیا تھا وہ اب تھم چکا ہے اور طویل دشوار کُن راستوں سے گذرتا ہوا میرے وجود میں سمٹ چکا ہے' جہلم نے اب خاموشی اختیار کی ہے اور آہستہ آہستہ اُبھرتی ڈوبتی لہروں کے ساتھ اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا ہے' اُس کی اپنی ایک منزل ہے لیکن میرے اندر جہلم کے پانیوں نے جو طوفان بپا کر رکھے ہیں' کیا اُن کی بھی کوئی منزل ہے؟ کیا یہ طوفان کبھی خاموشی اختیار کر جائیں گے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو بار بار میرے ذہن کے پردوں سے اُگتا ہے اور ایک کھلبلی سی مچا دیتا ہے' میری سوچیں بے حس ہو جاتی ہیں اور میری آنکھیں بے نور..... نہ تو میں دیکھ سکتی ہوں اور نہ ہی سوچ سکتی ہوں۔ یہاں پُل پر آنے سے پہلے میں کتنی بار مر مر گئی' آخر وہ کون سا دکھ ہے جو میں برداشت نہ کر سکی اور ہمت ہار بیٹھی' جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس نے مجھے گھر سے باہر آنے پر مجبور کیا اور یہاں ایک خطرناک موڑ پر کھڑا کر دیا..... گھر.... میرا گھر جو اب سے کچھ دیر پہلے میری محبت کی آماجگاہ تھا' میرے لئے جنت سے کچھ کم نہ تھا اب بے سکونی کا لبادہ اوڑھ کر میری یہ جنت گھرے سناٹے اور پُراسرار خاموشی میں دُھواں دُھواں سا منظر پیش کر رہی ہے۔ بار بار' قدم قدم پر مرنے سے بہتر ہے کہ ایک ہی بار مر جاؤں لیکن میرے یہ دو معصوم پیارے پیارے بچے..... سلمان اور صابر.... اِن کو کس کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں' کن کے حوالے کروں؟ کیا میں اتنی ظالم بن گئی ہوں' اِس قدر کٹھور کہ اپنے ہاتھوں سے دونوں بچوں کو کھو دینا چاہتی ہوں۔ زرا اِن کی جانب دیکھئے.... کیسے خوش ہیں' زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ناآشنا' کاغذ کی ناؤ بنا کر انہوں نے دریا میں پھینک دی ہے اور ایک بڑی سی لہر اسے دور لے گئی ہے دونوں خاموشی سے تالیاں بجا رہے ہیں..... یہ دونوں' میرے دونوں بیٹے زندگی سے بھرپور ہیں' انھیں

اپنی ناکامی پر بھی ہنسی آتی ہے، میں اُنھیں کیسے موت کو سونپ دوں، میں تو پہلے ہی بہت کچھ کھو چکی ہوں لیکن اب......؟!

کل جب صبح ہوگی تو شہر کے سارے اخبار چیخ اُٹھیں گے..... ایک عورت نے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ دریا جہلم میں کود کر خودکشی کر لی اور کشمیر کے ساری مائیں حیران ہو ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھیں گی۔ آخر وہ کون سا دکھ تھا، وہ کون سا کرب تھا جو یہ ماں برداشت نہ کر سکی..... آج میں... میں ایک عورت اپنی ہی صلیب کندھوں پر اٹھائے اِس پُل پر آ گئی ہوں، میں جانتی ہوں، بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں، مجھے احساس ہے اس بات کا کہ میں جب اپنے دونوں بچوں کو اپنے وجود سے لپٹا کر پانی میں کودوں گی تو وہ دونوں بڑی التجا بھری نظروں سے مجھے دیکھ لیں گے، اِن کی نگاہوں میں اس قدر دکھ ہوگا، درد و کرب ہوگا کہ مرنے سے پہلے میں نہ جانے کتنی مرتبہ مروں گی۔ وہ چیخ چیخ کر کہیں گے۔

''امی پلیز.... ایسا نہ کرو، ہم مرنا نہیں چاہتے''

ان کی چیخیں جہلم کا سینہ چیر کر رکھ دیں گی، ہواؤں کے قدم رُک جائیں گے، فضائیں جم جائیں گی، کائینات کا دم گھٹ جائے گا، یہ چیخیں قیامت تک ہر اُس ماں کو سنائی دیں گی جو اِس پُل سے گزرے گی... میں بھی ایک ماں ہوں اور دُکھوں کے اِس پُل پر جانے کب سے کھڑی ہوں!!

''امی ہمیں گھر لے چلو جہاں ہمارے ڈھیر سارے کھلونے ہیں، جہاں کھیلنے کے لئے ہمارا چھوٹا سا آنگن ہے... امی یہ پانی بہت گہرا ہے، ہمیں ڈر لگتا ہے، امی تم نے دیکھا ہماری ناؤ ابھی ابھی کیسے ڈوب گئی، نظر بھی نہیں آ رہی ہے، جانے کسی کنارے لگی کہ نہیں امی اب تو ابو گھر آئے ہونگے، وہ ہماری راہ دیکھ رہے ہونگے، گھر کے گوشے گوشے میں تلاش کر رہے ہونگے، ہمیں نہ دیکھ کر جانے کیا سوچ رہے ہونگے، گھبرا گئے ہونگے.... امی چلو.... گھر چلو؟''

اپنے حواس پر چھائی ہوئی ان چیخوں سے بچنے کے لئے میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی ہیں اور اب میں جہلم کے بہتے ہوئے پانیوں کی جانب دیکھے جا رہی ہوں آس پاس کی ساری دُھند، ساری کہر میری آنکھوں میں بھرتی چلی جا رہی ہے، ہر شے دُھندلی دُھندلی سی ہوگئی ہے اور مجھے لگ

رہا ہے کہ جہلم نے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے اُداسی کی چادر میں لپیٹ لیا ہے وہ اور اُداس نہیں ہونا چاہتا!

''چلو میرے بچو لوٹ چلتے ہیں''

میں اپنے بچوں کو اپنے دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر پُل سے نیچے آگئی ہوں۔ ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ میرا گھر' میری جنت گہرے سناٹوں میں کھوئی کھوئی سی اب میرے سامنے ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ گھر میں قدم رکھتے ہی سلمان اور صابر مجھ سے پوچھیں گے۔

''امی اب تو بتا دو کہ ابو کہاں ہیں''

میں گھر کا دروازہ کھولتی ہوں اور اپنے بچوں کی طرف دیکھتی ہوں۔

''اندر آؤ میرے جگر کے ٹکڑو۔ تمہارے ابو ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں' اسی گھر میں مگر تم انھیں دیکھ نہیں سکتے۔ مل نہیں سکتے!''

''کیوں..... کیوں امی''

اب میں ان بچوں کو کیسے بتاؤں' کیسے سمجھاؤں کہ کشمیر کی سرخ بستی میں اَن گنت بے نام قبروں میں اُن کی قبر کو تلاش کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔۔۔!!!

☆☆☆☆☆

قطرہ قطرہ سمندر

''میں پاگل ہوں''

''نہیں بیٹا تم پاگل نہیں ہو''

''یہ..... یہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے''

''بیٹا یہ ڈاکٹر صاحب ہیں، تم بیمار ہو نا اِسی لئے انجکشن لگانے آئے ہیں''

اکرم نے کچھ کہے بغیر اپنی دونوں بانہیں ڈاکٹر کی جانب بڑھا دیں، اس کی دونوں بانہیں انجکشن کی سوئیوں سے پہلے ہی چھلنی ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر نے دونوں بانہوں کو قریب سے دیکھا دائیں بانہہ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک نرم سی جگہ دیکھ کر انجکشن کی سوئی اُس کے اندر گھسیٹ دی، اکرم کے منہ سے ایک آہ نکلی ماں نے گردن دوسری طرف پھیر لی۔ پھر ڈاکٹر نے آلہ لگا کر بغور دیکھا، اکرم کے دل کی بے قرار دھڑکنوں کو سنا، پھر اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اِن بے رنگ اور بے خواب آنکھوں میں پوشیدہ خوف و ہراس کو دیکھ کر اپنی پلکیں جُھکا لیں!

''میں نے انجکشن دے دیا ہے'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''لیکن یہ بتا دیجئے کہ اِن کی یہ حالت کب سے ہے''

''قریب قریب دو ماہ سے''

''کیا عمر ہوگی''

''اٹھارہ برس''

''کوئی خاص بات، کوئی خاص حادثہ کوئی مہلک بیماری'' ڈاکٹر نے جاننا چاہا

''نہیں ایسا کچھ بھی نہیں... البتہ کوئی تین ماہ قبل جب یہاں کے حالات بہت زیادہ بے قابو ہونے لگے۔''

''حالات تو اب بھی قابو میں نہیں ہیں'' ڈاکٹر نے بات کاٹتے ہوئے کہا

''اُن دنوں سارا شہر آہوؤں اور کراہوں میں اُلجھا ہوا تھا' نا اُمیدیوں اور ناانصافیوں نے گھیر رکھا تھا' ہم سب کو ہر سمت موت اور ویرانی کا سناٹا تھا۔ گھٹن تھی' آگ تھی... دھواں تھا....

''تب کیا ہوا تھا، میڈم''

''تب... ڈاکٹر صاحب.. کیا بتاؤں' کیسے بتاؤں' بے تحاشا رونے کو من کرتا ہے... تب ایک کریک ڈاؤن کے دوراں اکرم کو بھی دوسرے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ ایک سفید رنگ کی جیپسی کے سامنے سے گذرنا پڑا اور کریک ڈاؤن اُٹھنے سے پہلے ہی اکرم ہماری نظروں سے دور ہو چکا تھا' ہم نے اس کی تلاش کی' بہت ڈھونڈا، کہاں کہاں نہیں گئے ہم... جن سے بھی ملنا ہوا انہوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ پھر جب پندرہ دن کے بعد اس نے گھر کے دروازے پر دستک دی تو وہ بہت تھک چکا تھا' ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ خاموش خاموش رہنے لگا' ڈرا ڈرا سا، کمرے کی کھڑکی کھولنے سے منع کرتا تھا' آنگن میں جانے سے ہچکچاتا تھا۔ حراست کے دوراں اُس پر کیا گذری وہ تو ہم نہیں جانتے لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ہمارا بٹیا، ہمارا اکرم نہ صرف جسمانی طور بلکہ ذہنی طور پر بھی صحت مند تھا' تندرست تھا' پڑھنے لکھنے میں دلچسپی رکھتا تھا اور اب، اب اس کی حالت آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ ڈاکٹر کچھ تو بتائیے کیا ہوا ہمارے اکرم کو۔''

''میڈم' میرا خیال ہے کہ اس کے ذہن پر کسی گہرے صدمے کا دباؤ ہے... میں کچھ دوائیاں لکھ دیتا ہوں' منگوا لیجئے۔ ایک ہفتہ بعد آپ انہیں میرے کلینک پر لے آئیے۔''

''میں پاگل ہوں۔'' اچانک اکرم چیخ اُٹھا۔

''نہیں آپ پاگل نہیں ہیں۔ ہاں میں اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ آپ کا ذہن کسی بڑے اور گہرے صدمے کی وجہ سے مفلوج ہوگیا ہے۔ کسی حد تک سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوگیا ہے۔ لیکن گھبرائیے نہیں، انشاء اللہ آپ بہت جلد صحت یاب ہونگے۔ سنیئے میڈم؟''

''جی کہیے ڈاکٹر صاحب''

''یہ جب لوٹ کر آئے تھے تو اِن کے جسم پر کوئی نشان وغیرہ''

''نہیں ایسا کچھ بھی نہ تھا''

''میرا خیال ہے کہ حراست کے دوراں اکرم کو جسمانی نہیں بلکہ ذہنی ٹارچر کا سامنا کرنا پڑا ہے اور یہ ذہنی ٹارچر جسمانی ٹارچر سے زیادہ مہلک ہے، ظاہری زخموں کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں اُن کی مرہم پٹی کر سکتے ہیں لیکن ذہنی ٹارچر، اندرونی زخم .... اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے اندر کے اِس درد کی شدت دیکھنے والے محسوس نہیں کر سکتے ہیں جسم کے اندر پھیلے ہوئے ان صدموں اور زخموں کا بروقت علاج نہ ہونے سے سارا وجود اِن کی لپیٹ میں آسکتا ہے۔

''ڈاکٹر صاحب، میرا بیٹا'' ماں نے درد بھرے لہجے میں پوچھا

''لیکن یہ واحد کیس نہیں ہے۔ ایسے ان گنت نوجوان ہمارے درمیان موجود ہیں، کچھ باہر سے زخمی ہیں اور کچھ اندر سے۔''

''میرے دل میں وسوسے پیدا ہو رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ایک سوچے سمجھے ارادے سے ہماری نئی نسل کو ذہنی طور پر مفلوج کیا جا رہا ہے، ان کے روشن اور تابناک مستقبل کو اندھیاروں دھکیل دیا جا رہا ہے۔''

اسی دوران اکرم کا ایک زوردار قہقہہ ابھرتا ہے۔ ''نئی نسل ... مستقبل کے معمار .... بجھتی آنکھوں کے اُجالے۔ کیا کیا تھا میں نے، کیا قصور تھا میرا... کیوں مجھے اذیت ناک لمحوں سے گذرنا پڑ رہا ہے۔''

''اکرم بیٹا۔ڈاکٹر صاحب''

''گھبرائیے نہیں میڈم...انھیں بولنے دیجئے، خوب بولنے دیجئے، اپنی بات کہنے دیجئے، اپنے اندر کے درد کو اُبھرنے دیجئے اور پھر.....؟!

''پھر کیا''...

''آپ جو سوچ رہی ہیں میں بھی اکثر ایسے ہی سوچتا ہوں ایسے ان نوجوانوں کو دیکھ کر، اِن کی حالت دیکھ کر، اِن کے لہولہان جسموں کو دیکھ کر، اِن کی آنکھوں کی تھکن، ان کے تازہ اور شگفتہ چہروں پر بکھری ویرانی کو دیکھ کر...اور پھر سوچتے سوچتے میں اپنی تاریخ کے اوراق پلٹنے لگتا ہوں۔اپنے ماضی میں جھانکتا ہوں۔میڈم کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ہماری آج کی قربانی، ہماری آج کی کہانی کل کی تاریخ بن جائے گی اور تاریخ ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔جو لوگ ہمیں پانی کا ایک قطرہ سمجھتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ سمندر کے پانی کا ہر قطرہ سمندر ہے۔اب چلتا ہوں، میڈم.....اپنا اور اپنے بیٹے کا خیال رکھئے گا۔''!!

☆☆☆☆☆

یہ دُھواں کہاں سے اُٹھتا ہے

۱) ''میں چور نہیں ہوں۔''

''نہیں بیٹا تم چور نہیں ہو''

''یہ کون ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں''

''بیٹا' یہ انسپکٹر صاحب ہیں' تمہاری تلاش میں یہاں آئے ہیں' کہتے ہیں کہ تم نے چوری کی ہے۔''

''چوری اور میں نے مما.... کب... کہاں' میں نے کوئی چوری نہیں کی ہے انسپکٹر صاحب..... ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے کوئی چوری نہیں کی ہے۔ مجھ پر کسی نے غلط الزام لگایا ہے۔''

''انسپکٹر صاحب۔''

''کہیئے میڈم جی''

''میرا بیٹا چور نہیں ہو سکتا' یہ تو ایک سٹوڈنٹ ہے کالج میں پڑھتا ہے' بھلا اس کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے' زندگی کی ہر شے' اس کے اپنے گھر میں میسر ہے.... چوری کا یہ الزام سراسر غلط ہے' بے بنیاد....''

''کیا عمر ہے آپ کے بیٹے کی''

''اُنیس برس''

''بالغ ہے۔ دیکھئے اگر یہ اپنا جرم قبول کرتا ہے تو اِس کے لئے بہتر ہوگا۔''

''کیسا جرم''

''چوری۔ میں نے کہا نا کہ اس پر چوری کرنے کا الزام ہے' ہمارے پاس شکایت آئی ہے' تحریری شکایت ایف۔آئی۔آر۔درج ہوا ہے۔''

''لیکن یہ چوری ہوئی کہاں اور کس نے یہ الزام لگایا ہے میرے بیٹے پر''

''اکرم۔میرا مطلب ہے آپ کا بیٹا دوائی لینے کے بہانے نامدار کلنک میں جا گھسا اور وہاں سے پانچ ہزار روپے اُڑا لئے۔''

''نامدار کلنک.... یہ کب گیا تھا وہاں' کس مقصد سے......دوائی لینے..... کس کے لئے.... آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے انسپکٹر صاحب۔''

''نہیں میڈم۔کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے۔''

''پر یہ نامداد کلنک ہے کہاں' میں تو پہلی بار یہ نام سُن رہی ہوں۔''

''دیکھئے میڈم میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے' آپ کے بیٹے کو میرے ساتھ چلنا ہوگا.... پولیس سٹیشن.... آپ بھی چل سکتی ہیں' اس کا بیان لیتے وقت آپ کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔''

''چلو بیٹا.... چلتے ہیں۔''

☆☆☆☆☆

''جی ہاں میڈم یہ پولیس سٹیشن ہے لیکن.... آپ کھڑی کیوں ہیں' بیٹھ جائیں...اچھا اکرم یہ بتاؤ' چند روز قبل تم نے کسی ایسے جلوس میں حصہ لیا تھا جو پتھراؤ کرنے میں مصروف تھا۔''

''جی ہاں''

''تو تم سنگ بازی میں بھی حصہ لیتے رہے ہو''

''صرف ایک بار....''

''دیکھئے میڈم آپ کا بیٹا خود ہی دوسرے جرم کا اعتراف کر رہا ہے''

''اکرم''

''ہاں مما..... میں نے حصہ لیا تھا دوایک پتھر بھی مارے تھے لیکن.... ''

''لیکن کیا بیٹا''

''میرے ساتھ اور بھی لڑکے تھے' میرے دوست' میرے ہم جماعتی' لیکن ہمارا نشانہ نہ تو پولیس تھی اور نہ ہی سرکار...... بلکہ.....!

''...بیٹا کہو''

''ہمارا نشانہ نامدار کلنک تھا''

''اب آپ کا بیٹا سیدھے راستے پر آرہا ہے. میں نے کہا تھا نا کہ چوری میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔''

''چوری سے میرا کوئی لینا دینا نہیں لیکن ہمارا نشانہ کوئی اور نہیں بلکہ نامدار کلنک کا اَن پڑھ مالک تھا' اُسی نے یہ الزام لگایا ہوگا مجھ پر.... چوری کا الزام۔آپ جاننا چاہتے ہیں انسپکٹر صاحب اِس کی وجہ؟''

''بیٹا کہو... سب کچھ سچ سچ کہو' صداقت اور ایمانداری سے کہو..... تمہیں میری قسم اکرم'' ماں نے درد بھرے لہجے میں پوچھا۔''

''انسپکٹر صاحب' آپ تو جانتے ہوں گے''

''کیا۔''انسپکٹر نے سوال کیا

''نامدار کلنک کا اَن پڑھ مالک نقلی دوائیوں کا دھندا کرتا ہے' نقلی گلوکاز لگا کر مریضوں کی زندگی سے کھلواڑ کرتا ہے کمزور اور بے سہارا لوگوں کا استحصال کرتا ہے۔موقع ملنے پر غریب اور نادار لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اُنھیں بے عزت کرتا ہے۔اُن کی برہنہ تصویریں کھینچ کر اُنھیں بلیک میل کرتا ہے اور اب...... ''

''اب کیا بیٹا'؟ ماں نے حیران ہوکر پوچھا

''اب اِس بات کا بدلہ لینا چاہتا ہے مجھ پر چوری کا الزام لگا کر... ''اکرم نے اونچے لہجے

میں جواب دیا۔

"سُن رہے ہیں آپ انسپکٹر صاحب"

"دیکھئے میڈم چوری کے تعلق سے میں نے آپ کے بیٹے کا بیان سُن لیا ہے، اِس کی پوری تفتیش ہوگی لیکن سنگ بازی کا الزام.... قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینے کا جرم.... فلحال سنگ بازی کے الزام میں آپ کے بیٹے کو یہاں رُکنا پڑے گا۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ، اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ....."

"میرے ساتھی، میرے کلاس فیلوز.... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انسپکٹر صاحب"

"جی ہاں.... کچھ تو یہاں ہیں، جو نہیں ہیں اُن کی تلاش جاری ہے"۔ انسپکٹر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆☆☆

<u>اخباری خبر</u>

چندروز قبل کئی درجن لڑکوں کو سنگ بازی کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا، اب سرکار نے اِن سب کو معافی دینے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اُنھیں رہا کیا جارہا ہے، عوامی حلقوں میں اس کی سراہنا کی جارہی ہے۔

☆☆☆☆☆

"اکرم.... ابھی تک تم پولیس سٹیشن میں کیوں رُکے ہوئے ہو، تم جاتے کیوں نہیں، تمہارے ساتھی تو کب کے چلے گئے، اور شاید تمہاری ممی بھی باہر تمہاری منتظر ہے۔" انسپکٹر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جاتو رہا ہوں مگر سوچ رہا ہوں کہ پھر لوٹ کر آنا نہ پڑے۔"

"کیوں"

"اسی لئے آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، کچھ جاننا چاہتا ہوں۔"

''کیا''

''جاننا چاہتا ہوں کہ نامداد کلنک کا وہ اَن پڑھ سماج دشمن مالک کہاں ہے۔ انسانی وقار کو سرعام نیلام کرنے اور معصوم چہروں کو داغدار بنانے والا مجرم کیا اب بھی کھُلے عام گھوم رہا ہے' اپنی مستیوں میں مست ہے۔ اب تک تو اُسے سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہئے تھا۔ آپ سوچ کیا رہے ہیں' خاموش کیوں ہیں۔''؟

''Law with take it own course''

''لیکن کب.... جب وہ''

''اب اور کیا کہنا چاہتے ہو لڑکے''۔ انسپکٹر نے سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے پوچھا

''بس ایک چھوٹی سی بات''

''وہ کیا''

''اِس وقت ہمارے اِردگرد جو عجیب سی ہلچل ہے' جو طوفان ہے اُسے روکنا ممکن نہ ہوگا اگر ہم ایسے درختوں کی حفاظت کرتے رہیں گے جن کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں' جو پاکیزگی اور تازگی کی بجائے کثافت کو فروغ دے رہی ہیں۔ ان کھوکھلی جڑوں کو اُکھیڑ دیجئے' ان کی جگہ نئے اور تازہ پیڑ پودوں کی آبیاری کیجئے۔ ان کی شاخوں پر کھلی کونپلوں کو پنپنے دیجئے۔ ان پھولوں کی مسکراہٹ میں جو مہک ہے اُسے پھلنے پھولنے دیجئے..... آپ یوں خُلا میں دیکھ کیا رہے ہیں' کیا تلاش کر رہے ہیں۔۔۔؟ میری طرف دیکھئے میری آنکھوں میں جھانکئے، ان آنکھوں میں پوشیدہ روشنی کو بجھنے نہ دیجئے؟ یہ نئی نسل کے مستقبل کی روشنی ہے' یہ علم اور قلم کی روشنی ہے۔ سنگ اور سنگ بازی سے اس روشنی کا کوئی تعلق نہیں.... میں اب چلتا ہوں' مما میری منتظر ہوگی... میری بات پر ضرور سوچئے گا....؟!

☆☆☆☆☆

ڈرامے

میری دھرتی میری جنت

صبح کا وقت!

(پس منظر میں گولیوں کی گھن گرج دور سے سنائی دیتی ہے اور پھر بچوں اور عورتوں کی چیخ وپکار ۔۔۔ یہ آوازیں آہستہ آہستہ فیڈ اوٹ ہو جاتی ہیں اور دھیمی دھیمی سی موسیقی ابھرتی ہے)

سجاد: (خود کلامی) یہاں کچھ بھی نہ ہوگا یہ کبھی بھی نہ سوچا تھا۔ موت کی سی ویرانی ہے، ہر سمت دُھول اُڑ رہی ہے، دھوئیں کے کثیف بادل اُٹھ اُٹھ کر فضا میں بکھر رہے ہیں۔

(۔۔۔موسیقی میں تیزی آجاتی ہے اور پھر مدھم پڑ جاتی ہے۔۔۔!)

سجاد: کل تک وہ چھوٹا سا بنگلہ ہلکی دھوپ کی چھاؤں میں کھڑا میری روح کی تسکین کا باعث تھا اور اب یہاں جُھلسی ہوئی اینٹوں اور پتھروں کا ایک انبار ہے اور بے کراں سناٹا...... اور میری بجھی بجھی سی آنکھیں مٹی اور راکھ کے اس انبار تلے جیسے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔۔۔ (لمبی آہ بھرتا ہے) آس پاس کے چند اور گھروں، چند اور مکانوں کی حالت بھی کچھ ایسی ہے اور ان کے مکین..... کہاں گئے یہ سارے.....

(۔۔۔خوفناک موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔)

سجاد: لیکن مجھے اپنے گھر کے مدفن کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔ جن پھولوں سے کبھی مہک اُبھرتی تھی، خوشبو آتی تھی وہ پھول اب مُرجھا چکے ہیں، جل چکے ہیں۔ بالکل یہیں اِسی جگہ پھولوں کی کیاریاں تھیں اور اب یہاں کچھ بھی نہیں۔۔ اِن کیاریوں میں پانی دیتے وقت جب نازش ہنستی تھی تو اُس کی خوبصورتی میں اور اضافہ ہوتا تھا۔

(۔۔۔نازش کے ہنسنے کی تاثرات سنائی دیتے ہیں۔۔ایک طویل ہنسی.......اور پھر موسیقی اُبھرتی ہےاور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے۔۔)

سجاد: اپنے گھر میں داخل ہوتے ہی نیند سے بھرپور انگڑائیاں مجھے اپنے آغوش میں لینے کے لئے لپکتی تھیں۔ میرا مکان۔۔ میرا گھر۔۔۔ ہم دونوں کے رہنے کی جگہ۔۔ ہم دونوں کا گھر ۔۔میرااور نازش کا گھر۔۔۔

(موسیقی اُبھرتی ہے۔اور جیسے دور سے نازش کی آواز اُبھرتی ہے۔)

نازش: آ گئے

سجاد: ہاں

نازش: بہت دیر کر دی آتے آتے.....

سجاد: تم انتظار کر رہی تھی۔

نازش: ہاں حسبِ معمول.... روز کی طرح.....

سجاد: اب اندر آنے کو نہیں کہو گی

نازش: آتے کیوں نہیں

سجاد: تم جو دروازے پر کھڑی ہو میرا راستہ روکے....

(۔۔دونوں ہنستے ہیں اور آہستہ سے یہ ہنسی فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے۔۔)

(۔۔موسیقی اُبھرتی ہےاور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے۔۔۔)

سجاد: ہاں.... ہاں یہی تو ہمارا گھر تھا، ہمارے رہنے کی جگہ۔۔ کیا نہیں تھا اس گھر میں۔۔ اس کی اُدھ جلی دیواروں میں اب بھی میری اور نازش کی محبت کے کتنے ہی اَن گنت لمحات پوشیدہ ہیں۔۔ مجھے یاد آرہا ہے۔۔۔ نازش اس گھر میں میری شریکِ سفر بن کر آئی تھی اور یہاں اس گھر میں ہماری محبت کو ابدیت مل گئی تھی۔۔ مجھے یاد آرہا ہے یونیورسٹی کا وہ زمانہ.... وہ ماحول جہاں ہم پہلے دوست بنے تھے اور یہ دوستی آہستہ آہستہ محبت میں بدل گئی۔

(تیز موسیقی کی ایک لہر)

سجاد: پیار کی قندیلیں جلا کر تم نے میری تاریک راہوں میں زندگی کی روشنی بکھیر دی ہے۔

نازش: محبت کی شمعیں جلتی ہیں اور جل کر ہی روشنی بکھیرتی ہیں۔

سجاد: ہاں نازو۔ محبت کی یہ شمعیں اب ہمیشہ ہمیشہ جلتی رہیں گی ہماری زندگی اِس روشنی سے تاباں رہے گی لیکن ...

نازش: لیکن کیا

سجاد: تم جانتی ہو کہ ہماری تعلیمی زندگی کا دور ختم ہو رہا ہے، چند دنوں میں فائنل رزلٹ آنے والے ہیں اور پھر۔۔؟

نازش: پھر کیا

سجاد: تم جانے کہاں چلی جاؤ گی

نازش: جانتی ہوں کہ میں کہاں جا رہی ہوں۔

سجاد: میں میں تو کچھ جان لوں

نازش: میں.... میں

سجاد: ہاں ہاں کہو..... رُک کیوں گئیں

نازش: (ہنستے ہوئے) میں تو اپنے گھر جاؤں گی

سجاد: گھر۔

نازش: ہاں گھر اور جانتے ہو میرا گھر کہاں ہے

سجاد: نہیں تو

نازش: بتا دوں

سجاد: ہاں ہاں اب تو بتا ہی دو..... دل گھبرا رہا ہے۔

نازش: تو سنو..... ذرا اپنا کان ادھر لے آؤ... ہاں... ہاں... ایسے ہی اور اب سنو.... میرا گھر وہی ہے جو تمہارا گھر ہے۔

سجاد: (خوش ہوکر) سچ

نازش: بھلا میں جھوٹ کیوں بولوں۔

سجاد: You are great -- یہ کہہ کر تم نے میری محبت کو ابدیت بخشی ہے، ایک لافانیت عطا کی ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ۔ You are great-the greatest

نازش: (ہنستے ہوئے) Really؟

(دونوں بھرپور قہقہہ لگاتے ہیں۔ موسیقی اُبھرتی ہے اور پھر فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے۔ شادی کا منظر... شوروغل... اور پھر مولوی صاحب کے قرآن پڑھنے کی آواز اُبھرتی ہے۔ جیسے نکاح خوانی کی تقریب ہو رہی ہو۔ اور پھر یہ آواز بھی فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے--)

سجاد: (ہنستے ہوئے) ارے تم شرما رہی ہو-- اور وہ بھی مجھ سے-- اپنے سجاد سے--- کچھ بولو تو سہی--- تمہاری یہ خاموشی اچھی نہیں لگتی-- چلئے آج میں ہی بولتا ہوں---- میری بات سُننے کے لئے تیار ہو--- تو سنو... تمہیں اپنے اتنے قریب دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے......

نازش: جیسے کیا

سجاد: ارے تمہارے ہونٹوں کو بھی زبان مل گئی-- میں تو سوچ رہا تھا کہ ساری عمر مجھے ہی بولنا پڑے گا۔

نازش: (ہنستے ہوئے) اور ساری عمر مجھے سننا پڑے گا-- یہی نا

.....Change....over.....

(جیپ چلنے کی آواز... اور پھر رُکنے کی آواز۔قدموں کی آہٹ۔دروازہ کھٹکھٹانے کی صدا۔ اور پھر دروازہ کھولنے کی آواز اُبھرتی ہے)

نازش: آگئے

سجاد: جی ہاں

نازش: کیالاؤں آپ کے لئے.... ٹھنڈا گرم.... چائے.... کافی

سجاد: نہیں ابھی کچھ نہیں

نازش: پھر بھی کچھ

سجاد: جی ہاں

نازش: کیا

سجاد: آپ کا کرم۔۔۔آپ کی عنایت، آپ کی محبت

نازش: لیکن ان سے بھوک نہیں مٹتی

سجاد: جی ہاں جانتا ہوں لیکن آپ کی صورت میں نہ جانے کیسا جادو ہے کہ آپ کو دیکھتے ہی پیٹ کی بھوک مٹ جاتی ہے اور

نازش: اور کیا

سجاد: آنکھوں کی بھوک بڑھتی ہے

نازش: دیکھئے کیپٹن صاحب، آپ اپنی فوجی یونیفارم اُتار دیجئے، سیولین لباس میں شریفوں کی طرح ہمارے ساتھ بیٹھ کر ایک کپ گرم گرم کافی پی لیجئے۔

سجاد: فوجی یونیفارم میں کیا ہم شریف نظر نہیں آتے۔

نازش: نہیں ایسی بات نہیں، گھر میں گھریلو لباس ہی بھلا لگتا ہے، اور یہ ہمارا گھر ہے جنگ کا کوئی میدان تو نہیں۔

سجاد: آپ کے سامنے جو کتاب پڑھی ہے یہ تو جنگ کے بارے میں ہے، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....

نازش: جی ہاں جنگ کے پس منظر میں ایک بڑی درد بھری کہانی کو قلم کار نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

سجاد: مجھے شاید جانا پڑے

نازش: (گھبرا کر) جانا پڑے۔۔۔کہاں

سجاد: کسی foreign country میں

نازش: کسی ٹریننگ کے سلسلہ میں

سجاد: نہیں تو

نازش: پھر

سجاد: ایک Peace Mission ترتیب دیا جا رہا ہے۔ انٹرنیشنل لیول پر، ہمارے ملک سے بھی کچھ فوجی اور غیر فوجی آفیسرس کو اس مشن میں شامل ہونے کے لئے nominate کیا جا رہا ہے۔ میرا بھی selection ہو چکا ہے۔ It is being done at the highest level۔ بہت بڑا اعزاز ہے یہ میرے لئے.... کیپٹن سجاد کے لئے.... لگتا ہے کہ تم میرے اس اعزاز سے خوش نہیں ہو۔

نازش: نہیں تو..... لیکن جانا کہاں ہے، کون سی کنٹری ہے وہ

سجاد: اِس کے بارے میں ابھی اطلاع نہیں دی گئی ہے۔ we have been told to be ready اور سنو۔

نازش: کیا

سجاد: اِس delegation میں دنیا کے اُن دوسرے ممالک سے بھی فوجی اور غیر فوجی آفیسرس کو شامل کیا جا رہا ہے جو تشدد، خون خرابہ اور دہشت گردی میں یقین نہیں رکھتے ہیں۔

نازش: لیکن وہاں۔۔۔I mean to say۔اس ملک میں آپ کا رول کیا ہوگا

سجاد: Very Important Role۔امن و شانتی کو فروغ دینا، بھائی چارے کا ماحول پیدا کرنا.... ملک کی معشیت کو سنبھالنا اور سنوارنا۔۔۔ وہاں کے لوگوں میں تعلیمی بیداری پید کرنا۔سنا ہے کہ اس ملک کو دہشت گردی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے مگر ہم سب کو مل جل کر ایک ایسا لائحہ عمل اپنانا ہوگا کہ دہشت گردی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو۔

نازش: کیا ایسا ممکن ہے

سجاد: ہاں ایسا ممکن ہے لیکن اس کے لئے sincereityاورdedication کی ضرورت ہے

نازش: کب جانا ہوگا اور کتنے دنوں کے لئے

(موسیقی کی ایک تیز لہر اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)

سجاد: کسی بھی وقت جانے کے لئے کہا جائے گا۔کب تک وہاں رہنا ہوگا ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تم مجھے ہر پَل ہر گھڑی اپنے قریب پاؤ گی۔

نازش: (افسردہ انداز میں) کیسے

سجاد: میں تمہارے دل کی دھڑکن بن کر تمہارے پاس رہوں گا (ہلکی ہلکی موسیقی ابھرتی ہے)۔۔ تمہارے ذہن کی سوچ بن کر تمہارے وجود میں پوشیدہ رہوں گا اور

نازش: (بات کاٹتے ہوئے) جانے بھی دیجئے کیپٹن سجاد.... کیا معلوم وہاں جا کر ہماری یاد بھی آئے گی۔چلئے اب change کر لیجئے۔تب تک میں کافی بنا لیتی ہوں۔

(۔۔۔موسیقی میں شدت آتی ہے اور فیڈ اوٹ۔۔۔)

.......Change....over.....

سجاد: (خود کلامی) بس ایک خواب تھا جو لمحہ بن کر ٹوٹ گیا، ٹوٹ کر فنا ہو گیا۔اب کچھ بھی نہیں، ہاں راکھ اور مٹی ہے اور یہ ٹوٹا ہوا جلا ہوا کھلونا۔۔نازش اور میرے پیار کا سنگم ٹوٹ چکا ہے وہ کلی

مسلی جا چکی ہے۔۔۔وہ پھول مرجھا چکا ہے۔

(موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی سجاد کے رونے کی آواز اُبھرتی ہے۔)

سجاد: (روتے ہوئے) میرا بیٹا۔۔میری خوشیوں اور تمناؤں کا مرکز، میرے مستقبل کی تعبیر، مجھے دیکھے بغیر ہی جانے راکھ کے کس ڈھیر کے نیچے سو چکا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، پھر کبھی نہ دیکھنے کے لئے، پھر کبھی نہ ملنے کے لئے۔

(سجاد روتے روتے رُک جاتا ہے اور پھر موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)

سجاد: مجھے یاد آ رہی ہے وہ شام۔۔اُس شام کی پیاری پیاری باتیں، نازش اور میری باتیں، وہ شام جیسے سارے جہاں کی خوشیاں میرے لئے سمٹ کر لائی تھی۔۔۔ہاں نازش نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ماں.... میرے بچے کی ماں.... ہم دونوں کا بچہ .....

۔۔۔۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔

(۔۔۔۔۔کوئی پیکٹ کھولنے کے تاثرات۔۔۔۔۔)

سجاد: اب آؤ بھی نا

نازش: بڑے بے قرار نظر آ رہے ہیں آپ۔۔۔کوئی خاص بات

سجاد: ہاں بڑی خاص بات ہے۔یکدم Confidential۔آؤ تو سہی

نازش: کہیے کیا ہے

سجاد: بس دیکھتی جاؤ۔

نازش: ارے یہ کیا

سجاد: کھلونے

نازش: کس کے لئے

سجاد: مُنے کے لئے

نازش: مُنے کے لئے (ہنستی ہے) ابھی سے۔سندر ہیں

سجاد: کون

نازش: یہ کھلونے

سجاد: میں سوچ رہا تھا میری تعریفیں ہو رہی ہیں

نازش: جی نہیں آپ کی نہیں

سجاد: میرا مُنا بھی خوبصورت ہوگا۔۔سندر ہوگا

نازش: آپ کیسے کہتے ہیں کہ لڑکا ہی ہوگا

سجاد: میرا دل کہتا ہے

نازش: اور میں کہتی ہوں کہ لڑکی ہوگی.....ایک پیاری سی منی

سجاد: دیکھتے ہیں کہ مُنے کا باپ جیت جاتا ہے یا منی کی ماں

(۔۔۔۔دونوں ہنستے ہیں۔۔۔۔اوراسی ہنسی کے دوران ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔)

......Change....over......

(۔۔۔۔۔۔۔۔۔فون کی گھنٹی بجتی ہے، ریسوراٹھانے کی آواز۔۔۔۔۔۔)

سجاد: ...Capt:Sajad Speaking..

Sir - that has been done - After the meeting was over I had a talk with Maj: Peter- Yes Sir - we will jointly sort out the matter- Right Sir .... Thank you Sir..........

(۔۔۔۔فون / ریسور نیچے رکھنے کی آواز۔۔۔۔)

سجاد: (خود سے) ارے یہ کیا ..... نازش کا خط..

(خط کھولنے کی آواز ـــــ)

سجاد: میرے اچھے ساتھی

(ـــ اور پھر سجاد کی آواز نازش کی آواز میں تبدیل ہوتی ہے۔ نازش کی آواز میں ـــ)

ہاں میں ہار گئی اور تم جیت گئے ـ ـ لڑکا ہوا ہے ہمارے ہاں ..... بالکل تمہارا جیسا، تم کب آرہے ہو اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے ـــــ اُسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی معصوم آنکھیں تمہاری تلاش کر رہی ہیں جیسے وہ اپنے کومل کومل نرم نرم ہونٹوں سے تمہیں پاپا کہنے کی کوشش کر رہا ہے ـ ـ بولو کب آرہے ہو۔

(ـ ـ نازش کی آواز ـ ـ سجاد کی آواز کے بدلے ـــــ)

تمہاری اپنی ..... نازش

(اور پھر دور سے بچے کی آواز سنائی دیتی ہے ـــــ)

پاپا ...... پاپا .... اور فیڈ اوٹ)

سجاد: (ہنستے ہوئے) I am a father now ـ ـ میں آؤں گا نازش .... ضرور آؤں گا ـ تم سے ملنے ... اپنے پیارے بیٹے کو دیکھنے ....

(فون ڈائل کرنے کی آواز ـــــ)

سجاد: Capt: sajad this end. could I come to see the Boss ; Thank you

(فون / ریسور رکھنے کی صدا اور فیڈ اوٹ)

ـــــــ وقفہ ـــــ

(آہستہ سے کمرہ کھٹکھٹانے کی آواز اور پھر دروازہ کھولنے کی صدا)

آفیسر: Yes Come in

سجاد: Thank You, Sir

آفیسر: How are you Captain

سجاد: Fine Sir

آفیسر: Pl. sit down

سجاد: Thank you Sir

آفیسر: کیسے آنا ہوا۔ صبح تو ہم مل چکے ہیں، کوئی خاص بات .... آپ کے ہاتھ میں کیا ہے۔

سجاد: سر یہ لیٹر ہے، میرے نام

آفیسر: Oh, I see

سجاد: یہ میری مسز کا لیٹر ہے۔ کشمیر سے آیا ہے۔ میرے گھر سے

آفیسر: (ہنستے ہوئے) ہاں ہاں جانتا ہوں کہ آپ جموں و کشمیر سٹیٹ سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کا گھر کشمیر میں ہے۔ ویسے آج آپ بہت خوش نظر آرہے ہیں I mean excited -- کوئی خاص بات

سجاد: Yes Sir، میں باپ بن گیا ہوں، ایک بیٹے کا باپ

آفیسر: Congratulations -- بہت بہت مبارک

سجاد: Sir, I have a request

آفیسر: ہاں ہاں بولئے

سجاد: میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ کشمیر........ for a brief vist

آفیسر: کشمیر؟ (آہ بھرتا ہے) کشمیر... جنت کشمیر....

سجاد: Kindly allow me

(--- بہت شدت کی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے ---)

سجاد: سر میں چلا جاؤں

آفیسر: کیپٹن میں جانتا ہوں کہ آپ کا گھر جانا ضروری ہے لیکن آپ بھول رہے ہیں کہ آپ اپنے

گھر، اپنے شہر اور اپنے ملک سے دور یہاں ایک مقصد لے کر آئے ہیں اور وہ مقصد ہے اس دیش میں امن و شانتی قائم رکھنا، اس ملک کی سالمیت کی حفاظت کرنا، اس مقصد کی بقاء کے لئے نہ صرف ہمارے ملک سے فوجی آفیسرس یہاں آئے ہیں بلکہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ دوسرے ملکوں سے بھی فوجی اور غیر فوجی آفیسرس یہاں موجود ہیں۔

سجاد: سر میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔I am a part of this team ۔میں جانتا ہوں کہ یہ فیصلہ انٹرنیشنل لیول پر ہوا ہے لیکن میرا

آفیسر: (بات کاٹتے ہوئے) آپ ایک اچھے آفیسر ہیں، اس ملک میں امن و شانتی قائم کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے، یہاں کے بے سہارا اور لاچار لوگوں کے ساتھ مل جل کر اُن کی اُمیدوں میں رنگ بھر دیا ہے۔

سجاد: سر مجھے اس بات کا پورا پورا احساس ہے لیکن میرا گھر، میرا شہر، میرا ملک وہاں بھی تو میری ضرورت ہے۔ میں صرف اپنے بچے کو دیکھ کر لوٹ آؤں گا... بہت جلد

آفیسر: اور وہاں (خاموش ہو جاتا ہے)

سجاد: سر آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں

آفیسر: ہاں میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کے شہر کو حالات نے ایک ایسے موڑ پر کھڑا کر دیا ہے جہاں زندگی ریزہ ریزہ ہو چکی ہے اور وہاں خود کو تلاش کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ میں ایک آفیسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست، ایک رہبر کے حیثیت سے کچھ کہنا چاہوں گا۔

سجاد: کہیے سر

آفیسر: آپ اپنی بیوی اور بچے کو وہاں سے لے آؤ۔I shall provide you all the facilities

سجاد: وہاں سے لے آؤں مگر کیوں؟ سر ہمارا بچہ ہوا ہے نازش اور میرا بچہ، اُس کو اسی جنت میں پلنا ہے، پنپنا ہے، پڑھنا لکھنا ہے، آگے بڑھنا ہے، اُسی جنت میں، اُسی دھرتی میں اپنے مستقبل کو سجانا اور سنوارنا ہے۔

آفیسر: اور وہ جنت، آپ کی وہ دھرتی ۔۔۔ آپ شاید بھول رہے ہیں آپ کی وہ جنت آہوں اور کراہوں سے ہم کنار ہو چکی ہے، اُس جنت میں موت اور ویرانی کا سناٹا ہے، اُداسیوں نے گھیر رکھا ہے سارے کشمیر کو۔۔ وہاں ہلچل تو ہے لیکن بے جان، آواز تو ہے لیکن خوف سے سہمی ہوئی، ڈری ہوئی۔

سجاد: جانتا ہوں سر، لیکن آپ ہی بتایئے اِس کا ذمہ دار کون ہے۔

آفیسر: I don't know

سجاد: آپ شاید واقعی نہیں جانتے میں بھی نہیں جانتا لیکن کبھی نہ کبھی ایک مورخ تو ضرور پیدا ہوگا جو اس کی تاریخ لکھے گا۔۔۔ اور تاریخ.... کسی بھی ملک کی ہسٹری ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

آفیسر: تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی آفیسر۔

سجاد: اب میرے لئے کیا حکم ہے۔

آفیسر: ٹھیک آپ جانے کے لئے بضد ہیں، میں چھٹی منظور کرتا ہوں۔ آپ اپنا چارج کیپٹن ورما کو دیجئے۔۔۔

سجاد: Right Sir

آفیسر: You can now proceed on one months earned leave..

سجاد: Thank you Sir

آفیسر: آپ جانے کی تیاریاں کر لیجئے۔۔۔ Ask my PA to book your seat

سجاد: Thank you very much, Sir

آفیسر: My good wishes are with you

(۔۔۔وقفہ۔۔۔۔موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔)

(۔۔۔ہوائی جہاز چلنے کے تاثرات۔۔۔اور فیڈ اوٹ)

.........Change.......over........

سجاد: (خود کلامی)۔۔ اور یہ میرا ملک ہے، میرا شہر ہے۔۔۔ میرا گھر ہے .... یہ .... میری دھرتی ہے، میری جنت ہے۔کل تک یہاں زندگی تھی، زندگی کی رونق تھی، گہما گہمی تھی اور آج۔۔آج یہاں کچھ بھی نہیں، کوئی زندگی نہیں۔صرف دھواں ہے، میں چیخنا چاہتا ہوں، چلانا چاہتا ہوں، اتنی اُونچی آواز میں کہ اِس ہولناک سناٹے کا دل کانپ کر رہ جائے۔۔اور اِن سنسان اور ویران کھنڈروں میں میری اس چیخ کی ایسی بازگشت سنائی دے کہ سارا عالم انسانیت درد و غم سے پھٹ کر رہ جائے۔۔۔۔۔۔لیکن میں خاموش ہوں۔

(۔۔۔تیز ہوائیں چلنے کے تاثرات .....اور ان ہواؤں کے پس منظر میں خاموش خاموش سی آواز اُبھرتی ہے۔۔ پاپا... پاپا.... ہواؤں میں اور شدت آجاتی ہے اور دفعتاً نازش کی آواز اُبھرتی ہے۔۔!)

نازش: آپ آگئے

سجاد: ہاں...

نازش: لیکن آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی.... میں اور آپ کا بیٹا کب سے آپ کی راہ دیکھ رہے تھے.... آپ کے آنے سے پہلے ہی وہ آگئے۔

سجاد: وہ کون

نازش: میں نہیں جانتی کہ وہ کون تھے.... سب کچھ اجاڑ کر چلے گئے.... آپ کی دنیا آپ کی کائینات، آپ کی جنت کو اجاڑ کر چلے گئے.... کچھ نہیں بچا آپ کے لئے..... نہ میں اور نہ ہی آپ کا بیٹا.....

(۔۔۔۔آواز بند ہو جاتی ہے اور سجاد پاگلوں کی طرح رونے لگتا ہے۔۔۔۔!)

سجاد: (روتے ہوئے) نازش۔ نازش کہاں ہو تم .... کہاں ہے میرا بیٹا، نازش سامنے تو آؤ.... میرے لئے صرف میرے لئے ....(آہستہ سے) کوئی نہیں آیا میری اِس جنت کو بچانے کے لئے ..... کوئی بھی نہیں۔

(تیز موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)

نازش کی آواز۔نہیں، کوئی نہیں آیا... ہمارے دیکھتے دیکھتے کوئی نہیں آیا۔۔۔

شاید ہمارے جانے کے بعد آئے ہوں لیکن کیا فائدہ.... ہمارے رکھوالی کرنے والے، ہمیں بچانے والے... اگر آئے بھی ہوں گے تو انھیں کیا ملا ہوگا.... ہمارے جھلسی ہوئیں لاشیں.... بے حس بے جان، بے کفن......!

(ہواؤں میں شدت آجاتی ہے اور نازش کی آواز فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔۔!!)

سجاد: (روتے ہوئے) شام کو اندھیرا پھیلے گا تو کون میرا انتظار کرے گا، کون میرے قدموں کی چاپ کا منتظر ہوگا، چاندنی رات میں کون مجھ سے محبت بھری باتیں کرے گا۔۔۔ کوئی نہیں۔۔ کوئی نہیں۔۔۔ اب کوئی نازش دلہن بن کر نہیں آئے گی، کوئی نازش میرے بچے کی ماں نہیں بنے گی، بچوں کا کوئی کھیل نہ ہوگا۔

(۔۔وقفہ۔۔۔اور پھر قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔۔۔۔!)

سجاد: میں جا رہا ہوں۔ ایک طوفان لئے، ایک خلش لئے۔۔ ہاں سوچ رہا ہوں، میں اپنے ملک اپنے شہر اور اپنے گھر سے بہت دور اُن کی جنت کی رکھوالی کر رہا تھا، وہ جنت میری تو نہ تھی، اُن لوگوں سے میرا کوئی رشتہ تو نہ تھا، وہ میرے ہم وطن نہیں تھے، ہم زباں اور ہم ذات نہ تھے پھر بھی میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اُن کی جنت کی رکھوالی کر رہا تھا، امن و شانتی کا پیغام دے رہا تھا، اُن کے ملک کو سنوارنے اور سجانے میں ایک اہم رول ادا کر رہا تھا۔۔۔ اور یہاں...... میرے وشال ملک میں، میرے اپنے کشمیر میں میری جنت کی رکھوالی کرنے والوں نے اِسے ویرانے میں بدل دیا۔ کیوں، کس کے لئے۔۔۔؟!

(موسیقی کی ایک لہر اُبھرتی ہے)

سجاد: میں نہیں جانتا... یہ سب کیوں ہوا، کیوں ہوا۔۔میرے پاس اِس کا کوئی جواب نہیں، شاید کسی کے پاس بھی نہیں۔اُن کے پاس بھی شاید نہیں جو میری جنت کو اجاڑنے کے ذمہ دار ہیں۔

(موسیقی کی ایک لہر)

سجاد: ہاں میں جارہا ہوں، لیکن کہاں..... کہاں ہے میری منزل۔کون لکھے گا میری جنت کی کہانی..... کون جوڑے گا اتہاس کی کڑیاں۔۔۔کشمیر۔۔میرا کشمیر۔۔۔کون لکھے گا میرے کشمیر کی کہانی.....

(موسیقی کی ایک اور لہر)

دور سے ایک آواز اُبھرتی ہے---------

اگر فردوس بروئے زمین است..................

---فیڈ اوٹ------

☆☆☆☆☆

سفر زندگی کا

(صبح کا وقت، بانسری کی تان سے خوشگوار ماحول کی عکاسی)

پاپا: آمنہ۔۔کہاں ہو۔۔۔کہاں ہو تم آمنہ، میں جا رہا ہوں

آمنہ: (دور سے) آرہی ہوں (قریب آکر) پاپا کچھ چاہیئے آپ کو

پاپا: نہیں تو؟ تم وہاں کیا کر رہی ہو کچھ خاص

آمنہ: نہیں تو پاپا۔۔۔شکیل بھیا کے کپڑے وارڈ روب میں رکھ رہی تھی (خوش ہوکر) چار سال بعد آیا ہے میرا بھائی انگلینڈ سے

پاپا: میرا بھی تو بیٹا ہے وہ۔۔۔پورے چار سال بعد گھر لوٹ آیا ہے، میں خوش ہوں کہ تم گھر میں ہر فرد کا خیال رکھتی ہو، آمنہ سوچتا ہوں جب تم سسرال چلی جاؤ گی تو میری دیکھ بھال کون کرے گا

آمنہ: پاپا میں نہیں جانے والی، میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گی، ہر پلِ ہر گھڑی، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

پاپا: Oh-No یہ کیسے ممکن ہے، اچھا چھوڑ دو Let you relax۔اب تمہارا بھائی شکیل بھی آیا ہے مل بیٹھ کر سارے معاملات نپٹا دیں گے اور ہاں... تمہارے بھائی کے لئے میں بھٹ صاحب کو زباں دے چکا ہوں.... آمنہ..... میری سویٹ بیٹی کاش آج تمہاری ماں زندہ ہوتی۔

آمنہ: پاپا..... ہاں آج ممی زندہ ہوتی تو.... (اُداس ہوکر) تو آپ اپنا دُکھ سُکھ اس کے ساتھ بانٹ لیا کرتے، کتنے بدقسمت ہیں ہم، آپ کو اکیلے اکیلے سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے (جذباتی

ہوتی ہے، گلہ رُندھ جاتا ہے)

پاپا: نا... نا بیٹی نا، یہ موتی نہ بہاؤ اِن آنکھوں سے

آمنہ: پاپا اِن آنسوؤں پر میرا کوئی اختیار نہیں

پاپا: چُپ ہو جاؤ بیٹا..... دیکھو تمہارا بھائی آیا ہوا ہے، لمبا سفر طے کر کے آیا ہے، تمھیں روتا ہوا دیکھکر پریشان ہوگا۔۔ کیا وہ ابھی سو رہا ہے... سونے دو.... اچھا میں چلتا ہوں I am... getting late....

(MUSIC BAR)

(قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے)

آمنہ: (اپنے آپ سے) کاش آج ہماری ماں ہمارے درمیان ہوتی۔۔ ارے یہ کیا شکیل بھیا بستر چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتا۔۔ ایک بار پھر دیکھتی ہوں اُسے

(کھڑکی کے پٹ کھولنے کی آواز)

آمنہ: بہت سو چکے..... اب اُٹھو بھی

شکیل: (خواب ناک آواز میں) کھڑکی بند ہی رکھو۔۔۔ Please don't disturb me

آمنہ: (ہنستے ہوئے) شکر ہے کہ نیند سے جاگ تو پڑے۔۔ دیکھو تو دھوپ کمرے کے اندر تک آگئی ہے

شکیل: لیکن یہ چُبھ رہی ہے میری آنکھوں کو

آمنہ: بھیا روشنی زندگی کا نام ہے اور زندگی کا دوسرا نام

شکیل: (بات کاٹ کر) روشنی؟ ہے نا

(دونوں ہنستے ہیں)

شکیل: (انگڑائی لیتے ہوئے) یہاں کتنا کچھ بدل گیا ہے آمنہ، وہ آس پاس کے مکان اور اِن میں رہنے والے.... اچھا وہ صابر چاچا ہے نا

آمنہ: نہیں تو پچھلے سال اُن کا انتقال ہو گیا

شکیل: اور وہ اپنی دلاری آنٹی ہے نا

آمنہ: تم اُسے بھولے نہیں

شکیل: کیسے بھول سکتا ہوں..... اپنوں کو کوئی کیسے بھول سکتا ہے

آمنہ: وہ یہیں ہے، اُس نے جانے سے انکار کیا اور کسی ایک بھی نہ سُنی

شکیل: انکار کیا.... That is great

آمنہ: ہاں بھیا وہ کہتی ہے اپنوں سے اور اپنی مٹی سے جو رشتہ ہے وہی سچا ہے باقی سب جھوٹ ہے۔ ہمارے لان کے اُس پار جو چھوٹا سا مکان ہے نا دلاری آنٹی ہی کا تو ہے۔

شکیل: میں خوش ہوں کہ وہ سلامت ہے، کتنی پُر خلوص تھی اور کس قدر لاڈ و پیار سے مجھے پالا ہے اُس نے

آمنہ: یہ سب باتیں بعد میں ہوں گی، چل کر نہا لو، پاپا نے تمہارے لئے نئے کپڑے بھی لائے ہیں

شکیل: میں سمجھا نہیں

آمنہ: I mean منگوائے ہیں، تمہاری پسند کے Jeans، میں نے وارڈ روب میں رکھے ہیں

شکیل: Imported ہوں گے مگر ایسی کیا مجبوری تھی میں خود بھی اپنے ساتھ Jeans لایا ہوں

آمنہ: معلوم ہے جب تم نے اپنے آنے کی خبر دی پاپا نے سب کو الرٹ کر دیا، یہ ٹھیک کرو، وہ ٹھیک کرو۔

شکیل: کیا سچ مچ

آمنہ: اور نہیں تو کیا، کب سے تمہاری راہ دیکھ رہے تھے، تمہارے کمرے کی دیواروں کا پینٹ تک بدل دیا کمرے کا قالین بدل دیا، پردے بدل دیئے۔

شکیل: (آہ بھر کر) مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔۔ یہاں آ کر سیدھے منہ بات تک نہ کی، ایرپورٹ پر میں جیسے ہی گلے ملنے کے لئے آگے بڑھا انہوں نے اپنی بانہیں کھولنا بھی گوارہ نہ کیا بس مجھے

دیکھتے ہی رہ گئے جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

آمنہ: نہیں یہ بات نہیں، آج کل سوچتے زیادہ ہیں، کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں، رات میں نے اُنھیں ممی کی تصویر سے باتیں کرتے دیکھا، آنکھوں میں آنسو تھے۔

شکیل: (آہ بھر کر) یہ سچ ہے کہ پاپا مام (Mom) کے بغیر تنہا اکیلا محسوس کرتے ہوں گے مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ To be honest صرف پاپا کے لئے یہاں چلا آیا ورنہ ایک بہت بڑی کمپنی کی آفر تھی جاب کے لئے

آمنہ: اچھا اور سناؤ لندن کی

شکیل: (ہنستے ہوئے) تین چیزیں وہاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، چھتری، برساتی اور آدمی

آمنہ: ہاں ہاں سنا ہے کہ لندن کے موسم کا کوئی بھروسہ نہیں

شکیل: Exactly ۔۔ ایک وسیع اور پھیلی ہوئی دنیا ہے، لیکن، سچی بات یہ ہے کہ سب کچھ میسر ہونے کے باوجود مجھے آپ لوگوں کی یاد ستاتی رہی، اپنی مٹی کی خوشبو بُلاتی رہی

آمنہ: اچھا بیڈ ٹی لے آؤں

شکیل: بیڈ ٹی نہیں پیتا، بریک فاسٹ لوں گا نیچے پاپا کے ساتھ، وہ ابھی تک سوئے ہوئے ہیں کیا

آمنہ: نہیں تو، وہ تو کب کے نکل گئے کام اس قدر پھیلا رکھے ہیں کہ اب سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے، میں نے کتنی بار اُن سے کہا کہ آخر یہ دوڑ دھوپ کیوں، اُن کے پاس ہر بات کا ایک ہی جواب ہے۔

شکیل: وہ کیا

آمنہ: کہتے ہیں میرا شکیل شہزادوں کی طرح جیئے میں یہی چاہتا ہوں

شکیل: (ہنستے ہوئے) شہزادے بگڑتے بھی ہیں نا

آمنہ: سچ بھیا، اتنا بڑا بزنس سنبھالنا اُن ہی کا دل گردہ ہے، حالانکہ اب صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی Hypertension کی شکایت ہے، وہ پہلی سی patience نہیں رہی، ذرا ذرا سی

بات پر مزاج میں تلخی آجاتی ہے

شکیل: پاپا دولت اور جائیداد اکٹھا کرنے میں تو لگے ہیں، میرے ساتھ بات کرنے کے لئے وقت نہیں ہے اُن کے پاس....؟

آمنہ: یہ زندگی کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے بھیا، پاپا ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں

شکیل: یعنی اُن کے عدمِ تحفظ کا احساس ابھی تک نہیں گیا، Sense of insecurity اِن کو اندر ہی اندر کھائی جا رہی ہے۔ اچھا چھوڑ دو .... مجھے یہ اٹیچی کھولنے دو

(چابی لگانے اور پھر اٹیچی کھولنے کی تاثرات)

شکیل: دیکھ میں تیرے لئے کیا لایا ہوں.... میری بہن کو دولہنیا جو بننا ہے

آمنہ: آپ بھی مجھے گھر سے بھگانا چاہتے ہیں

شکیل: نہیں فلحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں، لیکن میری تھوڑی ہی چلے گی

آمنہ: پاپا نے سب کچھ طے کیا ہوا ہے

شکیل: آمنہ ہر باپ چاہتا ہے کہ بچے آباد ہوں ..... مگر ہوگا سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق

آمنہ: کاش ایسا ہو سکتا.... لیکن یہ بھی تو دیکھو نا کہ میرا کس قدر خیال رکھتے ہیں، مجھے صبح کالج چھوڑ جاتے ہیں، شام کو pick up کرنے آتے ہیں اور اپنے ساتھ گھر لاتے ہیں

شکیل: حالانکہ گھر میں دو عدد ڈرائیور اور دو عدد کاریں بھی ہیں، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمہاری آزادی سلب کرنا چاہتے ہیں

آمنہ: No No میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ He is actually carning too much. اور یہ کوئی غلط بات تو نہیں۔

-----------وقفہ-----------

MUSIC BAR

(کار کے آنے اور پھر رُکنے کی آواز)

پاپا: ارے تم لوگ ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔۔۔آمنہ تم نے کالج نہیں جانا ہے کیا۔۔۔چلو آج تمہارا بھائی تمھیں کالج چھوڑ آئے گا۔

شکیل: پاپا ذرا دیکھو میں آپ کے لئے کیا لایا ہوں۔Full Length Suit

پاپا: ذرا دیکھوں تو۔۔۔ارے جب لانا ہی تھا تو میرے رُتبے کا بھی کچھ خیال کرتے، لاکھوں میں کھیلتے ہوئے باپ کے اکلوتے بیٹے ہو۔

شکیل: (قدرے اونچے لہجے میں) پاپا

پاپا: اچھا نہیں بولتا، میں نے بزنس کو کہاں کہاں تک پھیلا دیا ہے یہ جان کر تو بہت خوش ہوگا

شکیل: (سنجیدگی سے) کچھ کچھ جان گیا ہوں

پاپا: جاننے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں بڑا فرق ہے

شکیل: مگر آپ کی صحت، پاپا آپ کو اپنی صحت کی ذرا بھر بھی فکر نہیں

پاپا: تم لوگ خوش رہو، آباد رہو، پھر میری صحت بھی ٹھیک رہے گی۔۔دیکھو بچو میں نے بہت کچھ کھویا، بہت کچھ پایا۔۔۔سکون کی موت مروں گا جب تمھیں زندگی میں settle ہوتے دیکھ لوں گا۔۔۔اپنی بہن کو کالج چھوڑ آنا۔

شکیل: ڈرائیور سے کہدیں گے وہ چھوڑ آئے گا۔

پاپا: مگر میں جو کہتا ہوں تم وہی کرو۔ مجھے کسی پر بھروسہ نہیں

شکیل: پاپا معاف کرنا، جنہیں اپنے آپ پر بھروسہ نہیں ہوتا وہ دوسروں پر بھی بھروسہ نہیں کرتے

پاپا: No discussions please۔۔آمنہ کو کالج چھوڑ کر بھٹ صاحب کے ہاں چلے جانا

شکیل: بھٹ صاحب کے ہاں... مگر کیوں؟

پاپا: بھٹ صاحب کے ورک شاپ کے ساتھ کول صاحب کا ورک شاپ ہوا کرتا تھا وہ میں نے اور بھٹ صاحب نے خرید لیا ہے۔

شکیل: اور کول صاحب

پاپا: وادی چھوڑ کر چلے گئے

شکیل: اتنا بڑا بزنس چھوڑ کر۔۔آپ نے اُنھیں روکا نہیں، آپ نے اُنھیں کیسے جانے دیا؟

پاپا: میرے پاس ایسی باتوں کے لئے وقت نہیں، میں جو کہتا ہوں تم وہی کرو اور مجھے کیا کرنا ہے میں اچھی طرح سے جانتا ہوں اور ہاں میں نے تمہارے واپس آنے کی خوشی میں ایک پارٹی دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ بھٹ صاحب کو ذرا یاد دلانا .... میں چلتا ہوں، آمنہ جلدی سے تیار ہو کر کالج چلی جاؤ.... اپنے بھائی کے ساتھ۔

(۔۔۔۔۔۔۔۔۔قدموں کی چاپ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

....A Long Music Bar..... Change over ......

شکیل: (جذباتی انداز) دلاری آنٹی، یہاں میرے سب ہیں پھر بھی میں اپنے آپ کو غیر سا اور اجنبی سا محسوس کرتا ہوں اور تم ... تم یہاں تنہا اکیلی رہتی ہو، دور دور تک تمہارا کوئی اپنا نہیں تمھیں ڈر نہیں لگتا۔

آنٹی: شکیل بیٹا..... ڈر..... خوف.... کیوں اور کس سے، کوئی اپنی دھرتی ماں کو بھی چھوڑ کر چلا جاتا ہے ماں کی گود کو خالی چھوڑ کے جانا اچھا ہے کیا۔۔ جو چلے گئے، انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ اپنی پہچان کھو دی ... پرائی مٹی میں، آب و ہوا میں پودا بھی ٹھیک سے نہیں پنپتا، سوکھ کر مر جاتا ہے۔

شکیل: آنٹی سوچتا ہوں اِس کا ذمہ دار کون ہے .....وہ جو اپنی جائیدادیں چھوڑ کر چلے گئے یا وہ جو اُن کی جائیداد کا سودا کرنے میں جٹ گئے۔

آنٹی: شکیل بیٹا اِس کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا۔

شکیل: آنٹی تم ملنے نہیں آئیں مجھ سے

آنٹی: آنا چاہتی تھی سوچا تم لوگ ایک دوسرے سے مل لو جی بھر کر باتیں کر لو تو پھر۔۔۔۔۔۔

شکیل: (بات کاٹ کر) پاپا نے ابھی تک ٹھیک سے دیکھا تک نہیں، باتیں کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، وہ صرف حکم چلانا جانتے ہیں۔

آنٹی: یہ تو اُن کی پرانی عادت ہے بیٹا (آہ بھر کر) تمہاری ماں کو بھی کتنے دُکھ سہنا پڑے

شکیل: (حیراں ہو کر) دُکھ سہنا پڑے

آنٹی: اور نہیں تو کیا، اب پرانی باتوں کو دہرانے سے کیا حاصل بیٹا، من ہی من میں سلگتی رہی، ترستی رہی

شکیل: آنٹی یہ تم کیا کہہ رہی ہو

آنٹی: ہائے وہ بیچاری کچھ بھی نہ دیکھ سکی، اُس کی ساری آشائیں ادھوری رہیں

شکیل: مگر کیوں؟

آنٹی: تو کیا تم سچ مچ کچھ نہیں جانتے؟

شکیل: بالکل نہیں (جذباتی ہو کر) کیسے مر گئی وہ..... آنٹی مجھے فوراً بتاؤ ابھی بتاؤ

آنٹی: تمھیں کسی نے کچھ نہیں بتایا

شکیل: آنٹی آپ کی قسم، میں کچھ بھی نہیں جانتا

آنٹی: اب اُس بات کو پردے میں رہنے دو بیٹا.... تمہاری زباں سے بات نکلی تو میں کہیں کی نہ رہوں گی

شکیل: آپ کی قسم آنٹی، اپنی قسم، میں زباں تک نہیں کھولوں گا

آنٹی: کہنا آسان ہے بیٹے، تمہاری زباں سے اگر ایک لفظ بھی نکلا تو میرے لئے مصیبت کھڑی ہو جائے گی، وہ بے حد شریف اور پردہ کرنے والی تھی ..... نماز کی پابند .... لوگوں کو شک ہے کہ اُس نے زہر کھا کر اپنی جان لے لی۔

........SAD MUSIC BAR....

شکیل: (جذباتی ہوکر) زہر کھا کر جان لی... '...I can't believe this

آنٹی: بیٹے اپنی آنکھوں سے تو میں نے نہیں دیکھا لیکن وہ مرے سے پہلے اچانک بے ہوش ہوگئی اور پھر اُنھیں کبھی ہوش نہ آیا۔ مرتے وقت اُس کے ناخن تک نیلے ہو گئے تھے۔

شکیل: آج تک.... ابھی تک مجھے اِن باتوں سے بے خبر کیوں رکھا گیا۔ کیوں آنٹی کیوں۔

آنٹی: (جذباتی انداز) اب اِن باتوں کی تہہ میں جانے سے کچھ نہیں حاصل ہونے والا .... دیکھ بیٹے میری لاج رکھنا، میں خود گھُٹ گھُٹ کر جیتی رہی ہوں اتنے سارے دن

شکیل: چلتا ہوں آنٹی

......(Music - Scene Change) ....

پاپا: (دور سے) شکیل.... (قریب آکر) شکیل آمنہ کہاں ہے۔

شکیل: کالیج گئی ہے پاپا

پاپا: اور تم نے اُسے drop نہیں کیا کالیج

شکیل: وہ ڈرائیور کے ساتھ چلی گئی اور میں آپ کے سامنے ہوں

پاپا: بھٹ صاحب کے ہاں گئے تھے

شکیل: نہیں، میں نے ضروری نہیں سمجھا اُن کے ہاں جانا

پاپا: ضروری کیا ہے اور کیا نہیں ہے، یہ دیکھنا میرا کام ہے، زندگی ڈھنگ سے گذارنے کے لئے ڈگری کی نہیں بلکہ تجربے کی ضرورت ہوتی ہے اور تمہارے پاس ڈگری تو ہے تجربہ صفر کے برابر ہے۔

شکیل: میں جانتا ہوں کہ آپ کے پاس کیا ہے اور میرے پاس کیا

پاپا: نہیں تم کچھ نہیں جانتے، کچھ جانتے تو میری ساتھ اِس طرح باتیں نہیں کرتے، میں تمھیں ایک رئیس کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں لیکن اس کے لئے تمھیں بھی کچھ کرنا ہوگا، کل کی

پارٹی اسی لئے arrange کی ہے کہ تمہارے جان پہچان بڑھے، تمہارے اثر ورسوخ میں اضافہ ہو اور سنو بھٹ صاحب کو موڑ میں رکھنا۔۔ میں جا رہا ہوں۔

(قدموں کی چاپ)

شکیل: (اپنے آپ سے) چلے گئے۔۔۔اب شام کو لوٹ آئیں گے کچھ اور سنانے کے لئے۔۔۔ میرا یہاں دل کیوں نہیں لگتا، کہیں کچھ ٹوٹ گیا ہے میرے اندر، ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ میری بے قراری بڑھتی جا رہی ہے۔

(موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)

آمنہ: کیا سوچ رہے ہو

شکیل: کچھ بھی تو نہیں

آمنہ: کچھ تو ہے

شکیل: سوچنے کے لئے بہت کچھ ہے، انسان سوچے گا نہیں تو پھر اُس کی زندگی میں ترتیب کیسے آئے گی، توازن کیسے پیدا ہوگا لیکن تمہارے لئے یہ سب باتیں بے معنی ہیں تم نے اپنی زندگی کو کالیج اور کچن تک محدود کر رکھا ہے، ہاں یاد آیا، تیاریاں مکمل ہیں نا۔

آمنہ: وہ میں دیکھ لوں گی تم فکر نہ کرو، پارٹیاں دینا پاپا کے لئے کوئی نئی بات نہیں، سب چکنے چکنے نوٹوں کا کمال ہے۔۔۔ وہ دیکھو دلاری آنٹی بھی ہماری طرف آ رہی ہے.... آؤ .... آؤ..... آنٹی

آنٹی: (آتے ہوئے) آج صبح سے ہی تم کو مصروف دیکھ رہی ہوں، کہیں شادی کی تیاریاں تو نہیں ہو رہی ہیں۔

شکیل: نہیں یہ بات نہیں، میرے لوٹ آنے کی خوشی میں پاپا کے یار دوست، اُن کے بزنس پارٹنر اور کچھ بڑے لوگ آ رہے ہیں، پارٹی ہونے والی ہے۔

آنٹی: بھگوان کرے تمہارے آنے سے تمہارے پاپا کو سُکھ شانتی نصیب ہو، دُکھ اِس بات کا ہے

کہ تمہاری ماں یہ آن بان نہ دیکھ سکی، تم چھوٹے تھے، اتنے سے تو تھے جب وہ اِس دنیا سے چل دی تھیں۔

(رونے لگتی ہے)

آمنہ: آنٹی آپ کی آنکھوں میں آنسو

آنٹی: کچھ نہیں بیٹا، یونہی بیتے دنوں کی یاد آگئی، تمہاری ماں یاد آئی، اچھا میں چلتی ہوں۔

آمنہ: جی آنٹی

آنٹی: سنو تو آمنہ بیٹی، اپنے بھائی کا خیال رکھنا، دیکھو تو کتنا کمزور نظر آرہا ہے۔

شکیل: نہیں ایسی کوئی بات نہیں، پہلے سے ذرا slim ہو گیا ہوں آنٹی

آمنہ: (چلتے چلتے) میں ذرا کچن سے ہو آتی ہوں

شکیل: O.K.

(پس منظر میں باتیں، ہنسی، قہقہے، موسیقی) CHANGE OVER

آواز ۱: That is really fasinating

آواز ۲: Lovely food

آواز ۱: اِن کی پارٹی میں ہر چیز قرینے سے ہوتی ہے، اِن کی بزنس sense کا جواب نہیں۔

آواز ۲: کون مقابلہ کر سکتا ہے اِن کا، مٹی سے سونا نکالتے ہیں

آواز ۱: آج تو خود بھی جوبن پر ہیں، بیٹے کا رشتہ بھٹ صاحب کی لڑکی سے طے کرنے جا رہے ہیں۔

آواز ۲: دیکھ نہیں رہے ہو کہ بھٹ صاحب کا کتنا خیال رکھا جا رہا ہے۔

(موسیقی کا ایک خوشگوار ریلا)

شکیل: (آہستہ سے) پاپا میں اب چلوں

پاپا: (آہستہ سے) نہیں نہیں یہ کیا سوچیں گے، کیا کہینگے۔ تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے

شکیل: (اپنے آپ سے) Suffocating بے سر پیر کی پارٹی ہے

بھٹ انکل: شکیل بیٹے، یہ کیا tune ہے، کوئی ڈھنگ کی موسیقی سنا دو

پاپا: انگلینڈ میں رہے کے آیا ہے نا، وہ لوگ شور کو ہی سنگیت کہتے ہیں

بھٹ: (ہنستے ہوئے) ٹھیک کہا آپ نے، ہم لوگ......

شکیل: (بات کاٹتے ہوئے) اور ہم ہیں کہ شور اور سنگیت میں بھی فرق نہیں کر سکتے۔

بھٹ: Is it really so

شکیل: دیکھئے انکل، سنگیت کی کوئی زباں نہیں ہوتی، کوئی مذہب نہیں ہوتا، اس کا تعلق ہمارے جذبات و احساسات سے ہے، ہماری موسیقی ہو یا ویسٹرن میوزک، دونوں کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔

بھٹ: مجھے نا بیٹے ولایتی چیزوں سے وحشت ہوتی ہے، چاہے وہ میوزک ہو یا کلچر

شکیل: (ہنستے ہوئے) مگر وسکی تو آپ foreign ہی پسند کرتے ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا

پاپا: شکیل (ڈانٹتے ہوئے) شکیل

شکیل: میں چلتا ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے

بھٹ: کیوں ہماری کمپنی آپ کو پسند نہیں بیٹے

شکیل: میری پسند یا ناپسند سے کیا فرق پڑتا ہے

بھٹ: فرق پڑتا ہے، میں ایک خاص مقصد سے یہاں آیا ہوں

شکیل: پاپا ایک منٹ

پاپا: کیا ہے

شکیل: (آہستہ سے) میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں

پاپا: بات بعد میں بھی ہو سکتی ہے، دیکھتے نہیں کتنے ذی عزت لوگ ہیں یہاں

بھٹ: شکیل جانا چاہتا ہے تو جانے دیجئے

شکیل: ہاں میں چلتا ہوں

......A Short Music Bar......

پاپا: شکیل کا اس طرح جانا آپ کو بُرا تو نہیں لگا

بھٹ: بالکل نہیں، اُس کی رگوں میں جوان خون ہے، ابھی ابھی ولایت سے لوٹا ہے وہاں کے بیک گراونڈ کا کچھ تو اثر ہوگا، ہمارے یہاں کا ماحول، رہن سہن، ہمارا بزنس، یہ سب سمجھنے کے لئے کچھ وقت لگے گا ہی۔۔ارے ہاں آپ نے اِن دنوں کتنے اور مکان خریدے۔

پاپا: بھٹ صاحب، اب تو قریب قریب سارے مکان بِک چکے ہیں اور جو باقی بچے ہیں ان کی خرید وفروخت میں کافی جھنجٹ ہیں۔

بھٹ: لیکن وہ لان کے اُس پار والا مکان۔۔۔وہ عورت اب بھی وہاں رہتی ہے۔

پاپا: آپ دلاری کی بات کر رہے ہیں، وہ اپنے گھر میں ہی رہتی ہے۔اکیلی تنہا ضرور ہے لیکن ہے دل گردے والی، کہتی ہے جو چلے گئے انہوں نے اپنی جنم بھومی سے وفا نہیں کی۔

بھٹ: (ہنستے ہوئے) سچ تو یہ ہے کہ وہ لوگ یہاں سے چلے نہ جاتے تو آپ کے وارے نیارے کیسے ہوتے (قہقہہ لگاتا ہے) اچھا اب چلتا ہوں، بے حد لذیز کھانا تھا۔

پاپا: جانے سے پہلے One for the road

بھٹ: انکار کرنا میری عادت نہیں

(دونوں ہنستے ہیں)

------موسیقی اور فیڈ اوٹ--------

پاپا: تم پارٹی سے اس طرح کیوں چلے آئے۔These are bad manners

شکیل: میری طبیعت ٹھیک نہ تھی

پاپا: مجھے بہانہ بازی سے چڑ ہے۔

شکیل: آپ کچھ بھی سمجھیں، میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ بٹ صاحب بڑے آدمی ہوں گے روپے پیسے کے لحاظ سے، مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔

پاپا: فرق پڑتا ہے، اِن کے ساتھ تعلقات بڑھانے میں ہمارا فائدہ ہے۔

شکیل: فائدہ..... کیسا فائدہ، آپ ہر بات اپنے فائدے کے لئے ہی کیوں سوچتے ہیں۔ صرف اپنے فائدے کے لئے۔

پاپا: میرے فائدے میں تمہارا نقصان تو نہ ہوگا بلکہ فائدہ ہی ہوگا، رتبہ بڑھے گا، عزت بڑھے گی اور پھر

شکیل: اور پھر کیا۔ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں آپ

پاپا: ہاں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے بھٹ صاحب کی بیٹی کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

شکیل: واہ پاپا واہ۔ میری زندگی کا فیصلہ آپ کر رہے ہیں اور وہ بھی مجھے confidence میں لئے بغیر۔

پاپا: (تحکمانہ لہجے میں) اِس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا (آہستہ سے) بٹیا میں تمہارا باپ ہوں، دشمن نہیں، ہر باپ کو اپنے بچوں کے دُکھ سکھ میں شامل ہونے کا حق ہے۔

شکیل: کیسے باپ ہیں آپ، اپنے ہی بچوں کا حق چھین رہے ہیں۔

پاپا: (چلاتے ہوئے) شکیل..... مجھے اونچی آواز میں بات سننے کی عادت نہیں

(زور سے دروازہ کھولنے کی آواز)

آمنہ: (آتے ہوئے) کیا ہوا پاپا، کیا بات ہے شکیل... آپ لوگ کیوں چلا رہے ہیں پار سے دلاری آنٹی آئی ہے۔

پاپا: تمہاری دلاری آنٹی آئی ہے تو میں کیا کروں، اپنے ہونٹ سی لوں، وہ بار بار یہاں آنے لگی ہے۔ آخر کیوں۔

شکیل: Hold it papa۔ آنٹی کے بارے میں کچھ نہ کہیے، آپ شاید بھول رہے ہیں کہ انہوں

نے آمنہ اور میری کافی دیکھ بھال کی ہے، پالا پوسا ہے، ایک ماں کی طرح۔

آمنہ: ہاں پاپا دلاری آنٹی نے ایک ماں کی طرح ہماری پرورش کی ہے، انسانی رشتوں کی عظمت کا احساس دلایا ہے اور کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ہماری ماں ہم سے بچھڑ چکی ہے۔

پاپا: میں جارہا ہوں اور جاتے جاتے تم سے کہہ دینا چاہتا ہوں شکیل کہ میرا فیصلہ اٹل ہے۔

آمنہ: آپ زیادتی کررہے ہیں پاپا۔ یہ شکیل بھیا کی زندگی کا سوال ہے، اُسے سوچنے کے لئے وقت دیجئے، شریک حیات چُننے کا آخری فیصلہ اُس کا ہی ہونا چاہیئے۔

پاپا: I don't know

(موسیقی اور فیڈ اوٹ)

---- دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز ابھرتی ہے ----

دلاری: کون ...... دروازہ کھلا ہی ہے اندر آجاؤ

(دروازہ کھولنے کی صدا)

دلاری: شکیل تم۔ کیسے آنا ہوا بہت دنوں بعد نظر آئے

شکیل: تم بھی تو بہت دنوں سے ہمارے یہاں نہیں آئیں

دلاری: تمہارے پاپا نے منع جو کیا ہے

شکیل: منع کیا ہے۔ Strange، مجھے کچھ نہیں معلوم

دلاری: جارہی ہوں یہاں سے، یہ گھر چھوڑ کر..... یہ مکان.....

شکیل: تم ٹھیک ہو نا آنٹی..... کیا بات ہے۔

دلاری: میں وہی کہہ رہی ہوں جو گھما پھرا کر مجھ سے کہلوایا گیا ہے۔

شکیل: (مفطرب لہجہ) کیا کہا گیا ہے۔

دلاری: مکان خالی کرنے کو کہا گیا ہے..... تمہارے پاپا یہاں ایک حویلی نما مکان بنانا چاہتے ہیں، شاید فیکٹری لگانا چاہتے ہیں۔

شکیل: یہ کیسے ہوسکتا ہے.... رہائشی علاقے میں فیکٹری کھل نہیں سکتی، یہ قانون کے خلاف ہے۔

دلاری: قاعدے قانون ہم جیسے لوگوں کے لئے بنتے ہیں۔

شکیل: نہیں ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے، تم یہیں رہوگی، اِسی گھر میں، اِسی مکان میں۔

دلاری: نہیں بیٹے نہیں، تمہارے پتا کے احسان کا بوجھ اب میں نہیں اٹھا سکتی۔

(رونے لگتی ہے)

شکیل: رومت آنٹی..... تم رولوگی تو میں کمزور محسوس کروں گا۔ کمزور اور بے بس (اعتماد کے ساتھ) تم یہیں رہوگی۔ اِس گھر میں.... اِسی مکان میں.... اسے کوئی نہیں خرید سکتا، کوئی نہیں گرا سکتا، یہاں تک کہ میرا باپ بھی نہیں یہ میرا وعدہ ہے تم سے

(قدموں کی چاپ)

شکیل: تم آگئیں آمنہ.... اچھا ہوا دیکھو آنٹی نے رو رو کر اپنی آنکھیں لال کردی ہیں، انھیں چپ کراؤ۔ چپ کراؤ انہیں آمنہ

-----موسیقی--------

............Scene change.......

آمنہ: شکیل بھیا

شکیل: تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو

آمنہ: تم نے دیر کردی پاپا بہت غصے میں ہیں، تم نے اُن کا غصہ نہیں دیکھا ہے۔

شکیل: جو نہیں دیکھا ہے وہ اب دیکھ لوں گا

آمنہ: تمہاری باتیں سُن کر ڈر محسوس ہو رہا ہے۔۔۔ وہ آرہے ہیں۔

پاپا: (زور سے) شکیل.... تم کہاں گئے تھے

شکیل: آنٹی کے ہاں گیا تھا

پاپا: دلاری کے ہاں.... اب وہاں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی، وہ یہاں سے جارہی ہے۔

شکیل: جارہی تھیں مگر میں نے روک لیا

پاپا: روک لیا...اِن معاملات میں دخل دینے والے تم کون ہوتے ہو.... آمنہ تم باہر جاؤ

آمنہ: جی پاپا

شکیل: نہیں آمنہ تم یہیں رہو گی...پاپا آمنہ کوئی دودھ پیتی بچی نہیں، پوسٹ گریجویشن کر رہی ہے۔

آمنہ: بھیا میرے لئے پاپا سے کیوں بحث کر رہے ہو، میں ہی چلی جاتی ہوں۔

شکیل: نہیں تم نہیں جاؤ گی، بلکہ میں ہی کمرے سے باہر چلا جاتا ہوں۔

(موسیقی کا ایک تیز ریلا)

آمنہ: بھیا رُک جاؤ، کہاں جا رہے ہو... (وقفہ) چلا گیا.... آپ بھی پاپا ہر بات کو ego کا مسئلہ بنا دیتے ہیں، ہر بات پر ناراض ہوتے ہیں، جو بات آپ غصہ میں آکر کرتے ہیں وہی بات پیار سے بھی سمجھائی جاسکتی ہے۔

پاپا: ارے اب تم ناراض ہونے لگیں (نرمی سے) میں جو بات کرتا ہوں، تم لوگوں کی بھلائی کے لئے کرتا ہوں، میرا جو بھی ہے سب تمہارا ہے.... اچھا بند کردو اب یہ رونا دھونا اور بھائی کو دیکھ لو.... جانے کہاں چلا گیا.... جاؤ اُسے منا کر لے آؤ۔

(۔۔۔۔موسیقی اور فیڈ اوٹ۔۔۔۔۔۔)

(فون کی گھنٹی بجتی ہے، ریسور اٹھانے کی آواز)

پاپا: ہیلو.... ہاں بول رہا ہوں، بھٹ صاحب آپ... اچھا تو ٹنڈر کھول دیئے گئے، کیا کیا ہمارا ٹنڈر O.K. ہو گیا ہے (وقفہ) ظاہر ہے کام شروع کرنا پڑے گا، میں چاہتا ہوں کہ آپ کا ہونے والا داماد میرا مطلب میرے بیٹے شکیل سے ہے یہ کام خود سنبھالے (وقفہ) آپ آرہے ہیں نا، ضرور آیئے.... کھل کر بات ہوگی.... اچھا... خدا حافظ

۔۔۔۔۔(ریسور رکھنے کی آواز)۔۔۔۔۔

شکیل: یہاں آکر مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں اپاہج ہو گیا ہوں۔

پاپا: نہیں بیٹا، ایسا نہیں کہتے۔ آج بھٹ صاحب آ رہے ہیں، یہ اُن کا ہی فون تھا، شادی کی تاریخ بھی تو طے کرنی ہے۔

شکیل: مجھے رشتوں کی یہ سودابازی ذرا بھی اچھی نہیں لگتی ...... میں جا رہا ہوں۔

پاپا: کہاں

شکیل: کہیں بھی

پاپا: کیا مطلب .... یہاں کس چیز کی کمی ہے آخر .... دو کاریں ایک بڑی کوٹھی، نوکر چاکر اس قدر پھیلا ہوا بزنس، اب تو ورک شاپ کے لئے مشینیں آنا شروع ہوگئی ہیں بھٹ صاحب کی خواہش ہے کہ بزنس کی وہ سائڈ تم ہینڈل کرلو۔

شکیل: پاپا میں بھٹ انکل کے ساتھ کوئی بات کرنے کے لئے راضی نہیں، نہ تو شادی کی اور نہ ہی بزنس کی۔

پاپا: دراصل تم کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے .... آخر تم نے سوچا کیا ہے۔

شکیل: کس بارے میں

پاپا: اپنے بارے میں

شکیل: مجھے اپنے بارے میں سوچنے کی فکر کیوں ہونے لگی، پڑھا لکھا ہوں، اپنی روٹی روزی کما سکتا ہوں

پاپا: زندگی صرف روزی روٹی نہیں ہوتی ...... تمہاری ماں بھی تو .....

شکیل: (بات کاٹ کر) ماں کا ذکر آپ نے صحیح وقت پر کیا، میں آپ سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ اُن کی موت کن پُراسرار حالات میں ہوئی ہے، سنا ہے کہ انہوں نے مجبور ہو کر اپنی جان لے لی۔

پاپا: شکیل یہ جھوٹ ہے سراسر جھوٹ

شکیل: تو پھر سچ کیا ہے

پاپا: تم اس طرح باتیں کرو گے تو پھر لوگ کیا کہیں گے

شکیل: وہ بھی ایسا ہی کہتے ہیں اُن کے منہ آپ نے بند کر رکھے ہیں

پاپا: کیا مطلب

شکیل: آپ کی ہر بات کے پیچھے آپ کا بزنس interest ہوتا ہے۔

پاپا: میں وہی کروں گا جسے میں اپنے لئے ٹھیک سمجھوں گا

(آمنہ آتی ہے)

آمنہ: (دور سے) شکیل (قریب آکر) بھیا تم سے بھی خاموش نہیں رہا جاتا، تم جانتے ہو کہ پاپا کو Hypertension ہے۔

پاپا: (بات کاٹتے ہوئے) یہاں کس کو میری فکر ہے اور رہی تمہاری دلچسپی کی بات تو تمہاری دلچسپی صرف ایک چیز میں ہے جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے تم اُسے تباہ کرنا چاہتے ہو، میری خریدی ہوئی عمارتوں کو Bulldoze کرنا چاہتے ہو، یہی نا۔ گھر کیسے بنتا ہے تم کیا جانو۔

شکیل: ہم جہاں رہ رہے ہیں، اِسے آپ گھر کہتے ہیں۔

پاپا: تو پھر یہاں آئے ہی کیوں۔

شکیل: آپ کی زنجیروں سے آزاد ہونے کے لئے افسوس اِس بات کا ہے کہ آپ اپنے بچوں کے جذبات واحساسات بھی نہیں سمجھتے، انسانی قدروں کی پرواتو دور کی بات ہے۔

آمنہ: پاپا کا دل دُکھانا کیا اچھی بات ہے۔

پاپا: بیس سال سے تم لوگوں کی دیکھ بھال کر رہا ہوں، ماں اور باپ دونوں کا فرض ادا کر رہا ہوں، تم کو پال رہا ہوں، اُس کا صِلہ یہ مِل رہا ہے، آخر تم لوگوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے، میں محنت کرتا ہوں، اپنا خون پسینہ بہاتا ہوں، آخر کس لئے، کس کے لئے ؟! اور تم ہو کہ تمہیں ذرا بھر فکر نہیں۔

آمنہ: خدا کے لئے اب خاموش ہو جایئے... ہمیں احساس ہے کہ آپ یہ سب کچھ ہمارے لئے کر رہے ہیں۔

شکیل: آمنہ مجھے تمہارے حال پر رحم آتا ہے، تم پنجرے میں بند ایک پنچھی کی طرح ہو جس کی چابی تمہارے پاپا کے پاس ہے، یہاں تک کہ تم اپنے گھر میں رہ کر اپنی ماں کو بھی یاد نہیں کر سکتیں... ماں کی یاد میں آنسو بہانے کے لئے تمہیں آنٹی کے گھر جانا پڑتا ہے۔

پاپا: دیکھا آمنہ کیا بول رہا ہے تمہارا بھائی

شکیل: جب سے میں یہاں آیا ہوں میں دیکھ رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ آپ مجھے استعمال کرنا چاہتے ہیں، اپنی انگلیوں پر نچانا چاہتے ہیں، You don't allow me to live, My own individual life?

پاپا: تم ایسی باتیں اس لئے کرتے ہو کہ تم ابھی جوان ہو، میری طرح بوڑھاپے کی دہلیز تک نہیں آئے ہو باتیں کرنا آسان ہے اور زندگی کے راستے تلاش کرنا ایک کٹھن کام۔

شکیل: آپ مجھے بھی اپنی مٹھی میں بند کرنا چاہتے ہیں تا کہ میں چل پھر نہ سکوں، میں اِس ماحول سے ناخوش ہوں، اِس طرح کے ماحول میں میں اپنے آپ کو تلاش نہیں کر سکتا، اپنی شخصیت، اپنے وجود سے واقف نہیں ہو سکتا، آخر مال و جائیداد اور دولت ہی سب کچھ تو نہیں ہیں۔ زندگی کے کچھ اور بھی تقاضے ہیں۔

پاپا: تم جھوٹ بول رہے ہو، میری دولت کے وارث تو تم ہی ہو۔

شکیل: دولت.... دولت.... دولت.... آپ اپنے آپ سے ہی پوچھ لیجئے، اتنی دولت حاصل کر کے آپ خوش ہیں۔ پاپا آپ اپنے کو دھوکہ دے رہے ہیں، سچائی کچھ اور ہے۔

پاپا: میں نہیں جانتا کہ تمہارے لئے سچائی کیا ہے، میرے لئے سچائی بس یہی ہے کہ آدمی گھُٹ گھُٹ کر نہ جیئے، دوسروں کے سامنے اُسے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔

آمنہ: (چلا کر) will you stop it now۔۔۔ آپ لوگوں سے خاموش نہیں رہا جا سکتا۔

شکیل: میری پیاری سی معصوم سی بہنا، آج مجھے بولنے دو.... پاپا میں جانتا ہوں کہ آپ خوش ہوں گے۔ بہت خوش ہوں گے اگر میں آپ ہی کی طرح سوچنے لگوں آپ جو چاہتے ہیں وہی میں

بھی چاہنے لگوں

آمنہ: شکیل

پاپ: شکیل تم اپنی حد سے بڑھ رہے ہو

شکیل: It is very suffocating here۔۔ میں جیسے انسانی وجود میں ایک پرچھائیں ہوں، ہر سمت تاریکی ہے، اندھیرا ہے اور اندھیرے میں پرچھائیں تک کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ میں جارہا ہوں، And left me tell you papa، آمنہ بھی میرے ساتھ جائے گی۔

آمنہ: بھیا ہم پاپا کو اِس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔

پاپا: تو کیا تم دونوں مجھے چھوڑ کر جاؤ گے۔

آمنہ: نہیں پاپا ہم آپ کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے، کہیں نہیں جائیں گے، کبھی نہیں جائیں گے (رونے لگتی ہے)۔

.......Scene change....

آمنہ: اب آپ آرام سے لیٹے رہئے اور کسی بھی چیز کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچئے، ڈاکٹر صاحب چار بجے دوبارہ دیکھنے آرہے ہیں۔

پاپا: (نقاہت بھرے لہجے میں) شکیل

آمنہ: وہ اپنے کمرے میں ہے، رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھا ہوا شاید خط کے ذریعہ آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔

پاپا: وہ مجھ سے بات بھی تو کرسکتا ہے۔

آمنہ: Papa relax، آپ کے ٹھیک ہونے پر سب کچھ ٹھیک ہوگا۔

........Scene change.....

(صبح کا وقت، پرندوں کی چہچہاہٹ)

پاپا: (اپنے آپ سے) آج میری طبعیت بہتر ہے، مجھے کچھ دیر کے لئے لان میں ٹہلنا چاہئے۔

(بستر سے اٹھنے اور کھڑکی کھولنے کے تاثرات)

پاپا: (اپنے آپ سے) آج موسم بھی تو بہت نکھرا ہوا ہے (حیران کُن لہجہ) لیکن یہ لفافہ.... یہ لفافہ کیسا ہے، میرے سرہانے کس نے رکھا ہے.... دیکھوں تو (لفافہ کھولنے کی آواز) شکیل کی ہینڈ رائٹنگ ہے، دیکھ تو لوں..... پڑھ تو لوں.....

(پاپا کی آواز میں)

پاپا، آپ جانتے ہیں کہ یہاں کے حالات نے پچھلے چند برسوں میں کیسا رُخ اختیار کیا۔ (پاپا کی آواز شکیل کی آواز میں بدل جاتی ہے) خوف کی تلوار سروں پر لٹکی رہی، کچھ لوگ گھروں سے بے گھر ہوئے تو کچھ اپنے ہی گھروں میں قیدیوں کی سی زندگی بسر کرتے رہے، کتنے ہی بچے یتیم ہو گئے اور کتنی ہماری مائیں اور بہنیں بیوہ ہو گئیں، روزگار کے راستے مسدود ہو گئے، تعلیمی شبعوں کو ناقابل تلافی نقصان ہوا، کچھ غرض کے دیوانوں نے اس صورت حال کا ناجائزہ فائدہ اٹھایا، اپنی چالاکی اور شاطرانہ چالوں سے لوٹ مچائی اور اپنی تجوریوں میں بے حساب دولت بھر دی۔ پاپا میری بات کا بُرا نہ مانئے، آپ کے پاس بھی بے حساب دولت ہے، زمیں جائیدادیں ہیں اور میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھے اور آمنہ کو آپ کی زمینوں سے اور مکانوں سے کچھ لینا دینا نہیں۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات نہ ہو تو ایک نیک مشورہ دینا چاہتا ہوں، آپ یوں کیجئے، ایک ٹرسٹ قائم کیجئے (پس منظر میں ایک مکان کے بیرون گیٹ پر ایک بڑا بورڈ نظر آتا ہے، کشمیر ٹرسٹ) ایک آدھ فیکٹری لگائے جس میں بے کار اور بے روزگار عزت وآبرو سے اپنی روٹی کمانے کے قابل ہوں (پس منظر میں ایک بورڈ لٹکا ہوا نظر آرہا ہے جس پر لکھا ہے Khan's cement factory) تو ایک یتیم خانہ کھلوائیے (پس منظر میں ایک بورڈ بے سہارا اور لاوارث بچوں کیلئے ٹرسٹ)، ایک اچھا خاصا میعاری اسکول شروع کیجئے جس میں بے سہارا اور بے بس بچوں کو تعلیم مل سکے (پس

منظر میں ایک بورڈ (Valley Educational Institute) میری باتوں سے یہ نہ اخذ کیجئے کہ میں آپ کو کچھ سکھانے یا کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں، جانتا ہوں کہ آپ کا تجربہ بے حد وسیع ہے لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ زندگی کا قافلہ کہیں نہ کہیں آ کے ٹھہر جاتا ہے، وقت کا دریا ہمیشہ ایک ہی رفتار سے نہیں بہتا..... یہ قانونِ قدرت بھی ہے، پاپا میں آپ کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ آپ میری بات مان لیں..... آمنہ میری ذمہ داری ہے ہمیں اُسے اپنے طور سے grow ہونے کا موقعہ دینا چاہئے۔ ایک آخری مگر اہم بات یہ ہے کہ دلاری آنٹی کہیں نہیں جائے گی وہ اپنی جگہ اپنے گھر میں ہمیشہ کی طرح رہے گی، آنٹی نے ہمیں ماں کا پیار بھی تو دیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اِس پورے ماحول میں اُس کی حیثیت ایک پُل کی سی ہے، ایک ایسے پُل کی جو دو کناروں کو آپس میں ملاتا ہے، ایک کر دیتا ہے..... ہاں پاپا........

(پاپا کی آواز)

آپ کا بیٹا..... شکیل

(موسیقی اور فیڈ اوٹ)

☆☆☆☆☆

وادیاں خاموش ہیں

(پس منظر میں ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)

----کاغذات بکھیرنے کی سرسراہٹ---

نجمہ: (دور سے) فرید

فرید: کیا ہے بی بی جی

نجمہ: (نزدیک آکر) کیا کر رہے ہو

فرید: شلف میں کتابیں قرینے سے رکھ رہا ہوں، بالکل بے ترتیب پڑی ہیں

نجمہ: تمھیں کمال بھیا بُلا رہے ہیں، کوئی کام ہوگا، تم چلے جاؤ

فرید: اور کتابیں

نجمہ: میں دیکھ لوں گی

فرید: ٹھیک ہے جی

نجمہ: اور ہاں اگر شازیہ کا فون آئے تو کہہ دینا کہ میں گھر میں ہی ہوں

------وقفہ------

(قدموں کی آہٹ)

نجمہ: (اپنے آپ سے) رات میں دیر تک ان کتابوں سے اُلجھتی رہی..... ان دنوں نیند بالکل نہیں آتی جیسے روٹھ گئی ہو، کسی سوچ کی طرح، کسی اَن دیکھے سپنے کی طرح..... میرے قریب آتی ہے تو بڑی جھجک کے ساتھ.... شرمائی سی

(کتابوں کو ترتیب سے رکھنے کے تاثرات)

نجمہ: یہ ناول (اوراق الٹنے کی صدا)..... یہ ناول ابھی اُدھورا ہے... میں یہ ادھورے اوراق کتنی بار پڑھ چکی ہوں پھر بھی بار بار پڑھنے کو من کرتا ہے۔اس کے ہر ہر جملے، ہر ہر لفظ میں مجھے اپنی زندگی کی بکھری ہوئی داستان دکھائی دیتی ہے۔لگتا ہے جیسے شبنم کے قطرے کنول کے پتوں پر بکھر گئے ہوں اور..... اور ایک اَن دیکھی سی تمنا دل کے کسی گوشے میں دھڑکنے لگی ہو(ٹھہر ٹھہر کر)۔لیکن کیا میری زندگی بھی اس ناول کی طرح ادھوری ہے، میری زندگی کے اوراق بکھرے پڑے ہیں، جب یہ ناول مکمل ہوگا تو شاید میری زندگی۔لیکن اب یہ ادھورا ناول مکمل کون کرے گا.... کون لکھے گا اسے......

(اوراق الٹنے کی صدا)

نجمہ: کتنا پیارا نام ہے۔

آواز: (نجمہ کی آواز میں) ناول یا ناول نگار کا

نجمہ: کون۔۔کون ہو تم

آواز: میں تمہاری آواز ہوں

نجمہ: میری آواز؟

آواز: ہاں تمہارے من کی آواز، ذہن کی آواز، روح کی آواز۔تمہارے وجود کی آواز

نجمہ: کیا کہنا چاہتی ہو

آواز: تمہیں ناول اس نے زیادہ اچھا لگتا ہے کہ تم ناول نگار کو چاہتی ہو۔۔اس ناول کے ہر لفظ میں تمہیں اس کی صورت دکھائی دیتی ہے، تمہاری سوچیں اس کی سوچوں سے ملتی ہیں، اس کی ہر سطر میں تمہارے ماضی کے حسرت بھرے لمحات دھوپ اور چھاؤں کا روپ اپنا کر اُبھرتے ہیں۔

نجمہ: میرا ماضی تو بے آواز ہے اور میرا حال بے پناہ اداسیوں کا سر چشمہ..... میرا مستقبل، میرا بھوش (خاموش).... پر تم کہاں ہو..... یہاں تو بھی نہیں کوئی میرے بغیر۔ہاں یہ میرے

اندر کی آواز تھی ..... آصف میرا ناول نگار .... کاش اسے میری محبت کا احساس ہوتا...... اور

(اوراق اُٹھنے کے تاثرات)

نجمہ: ناول کا یہ باب .... کل رات پڑھتے پڑھتے آنکھ سی لگ گئی ....اِس وقت دوبارہ پڑھنے کو من کرتا ہے .... لکھا ہے ..... میں چاہتا ہوں (نجمہ کی آواز آصف کی آواز میں بدل جاتی ہے) میں چاہتا ہوں کہ میرے کمرے کا دروازہ کسی دوسرے کے لمس سے بند ہو۔۔ میرے بستر پر کسی دوسرے کی دھڑکنیں سنائی دیں، میرے صوفہ پر کسی دوسرے کی سانسیں میری یادوں کو سمیٹ لیں، میرے کمرے کا ساماں کسی دوسرے کے ہاتھوں سے سجے سنورے، کتنی چھوٹی سی حسرت ہے، کتنی درد بھری تمنا ہے۔۔ لیکن کیا میری تمنا، یہ حسرت پوری ہونے سے میرے جیسے لاکھوں لوگوں کی حسرتیں اور تمنائیں بھی پوری ہوں گی۔ ایسا نہیں ہوگا۔۔ اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو مجھے (آصف کی آواز نجمہ کی آواز میں بدل جاتی ہے) اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو پھر مجھے اپنے لئے سوچنے کا کوئی حق نہیں۔

(تیز موسیقی اور فیڈ اوٹ)

کمال: نجمہ ..... نجمہ

نجمہ: کیا ہے بھیا

کمال: کیا ہورہا ہے

نجمہ: تیرا انتظار کررہی ہوں کمال بھیا

کمال: یہاں تو آؤ ..... دیکھو کون آیا ہے، میرے ساتھ .... آیا نہیں ہے بلکہ پکڑ کے لایا ہوں۔

(۔۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔۔قدموں کی آہٹ)

کمال: دیکھو یہ آصف ہیں، میرے بہت ہی اچھے دوست، ویسے بڑے مقبول کہانی کار اور ناول نگار بھی ہیں، اپنی کہانیوں کی تلاش میں یہاں آگئے ہیں، اِن خاموش وادیوں میں، اچانک

مڈبھیڑ ہوگئی ہماری

نجمہ: آداب

کمال: کیا دیکھ رہے ہو بھائی، یہ میری بہن ہے نجمہ ....اِن کے بارے میں ایک بات بتادوں نجمہ

نجمہ: (ہنستے ہوئے) ضرور بتادیجے

کمال: ہم دونوں دوست ضرور ہیں لیکن ملاقاتیں کم ہی ہوتی ہیں، کبھی کبھار ہی ملنا ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے خیالات میں کوئی ہم آہنگی نہیں

آصف: ارے بھائی انہیں کیوں بے وجہ پریشان کررہے ہو

نجمہ: نہیں میں کیوں پریشان ہونے لگوں۔۔۔ بھیا آپ اپنی بات پوری کرلیجئے نا

کمال: نجمہ ویسے یہ شخص بڑا ہی دلچسپ ہے لیکن ہمیشہ زندگی کی خوبصورتی میں بدصورتی کی تلاش کرتا ہےاورتم جانتی ہو کہ مجھے بدصورتی سے بڑی نفرت ہے۔

نجمہ: (اپنے آپ سے) آصف۔ ناول نگار....اِن کی کچھ تخلیقات پڑھی ہیں.... کچھ جریدوں میں اِن کے بارے میں پڑھا بھی ہے لیکن انھیں دیکھ کر یہ احساس کیوں ہورہا ہے کہ ہر شئے مبہم ہے، دُھند میں لپٹی ہوئی ہے۔

۔۔۔۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔۔۔

(پالیاں ٹکرانے کی آواز)

نجمہ: آپ کے لئے کافی

آصف: شکریہ

کمال: اس پہاڑی علاقے کی صبحیں اور شامیں ویسے بھی یخ میں ڈوبی رہتی ہیں لیکن آج معمول سے کچھ زیادہ سردی ہے۔ نجمہ

نجمہ: کیا ہے بھیا

کمال: ایک کپ گرم گرم کافی اور مل سکتی ہے

نجمہ: ہاں ہاں ضرور .... آپ بھی لیں گے نا

آصف: اگر زحمت نہ ہو

نجمہ: بھلا اِس میں زحمت کی کون سی بات ہے۔ فرید.... (زور سے) فرید

فرید: کیا ہے بی بی جی..... آ رہا ہوں (نزدیک آ کر) کہیے بی بی جی

نجمہ: فرید کافی لے آؤ.... لیکن بالکل گرم ..... اور شوگر کم....

فرید: جی لاتا ہوں.....

------وقفہ------

آصف: میرے ذہن میں جس نئے ناول کا خاکہ پنپ رہا ہے اُس کے پس منظر کے لئے یہ پہاڑی علاقہ خوب نکھرے گا...... یہ وادیاں......

نجمہ: لیکن ابھی آپ نے نہ تو یہ پہاڑی علاقہ دیکھا ہے اور نہ ہی یہاں کی وادیاں

آصف: دیکھنے کے لئے ہی تو آیا ہوں

کمال: اور پھر دیکھنے میں دیر بھی کتنی لگے گی..... چھوٹی سی جگہ تو ہے۔

نجمہ: نہیں بھیا، جگہ چھوٹی ہو یا بڑی..... ہر جگہ کی اپنی اہمیت اور افادیت ہوتی ہے ایک کریکٹر ہوتا ہے، اکثر لکھنے والے اِن باتوں کو نظر انداز کرتے ہیں اور اس طرح وہ صحیح عکاسی نہیں کر سکتے۔

کمال: نجمہ

آصف: انھیں کہنے دو یار

نجمہ: میں کہہ رہی تھی کہ اگر آپ نے اپنی کہانیوں میں صحیح ماحول اور صحیح کرداروں کی نشاندہی کرنی ہے تو اس ماحول میں گم ہونا پڑے گا، اِن کرداروں کے ساتھ گھل مل کے رہنا ہوگا، تب ہی آپ اِن معصوم چہروں کے نقوش ابھارنے میں کامیاب ہونگے (جذباتی انداز) یہ چہرے بے داغ ہیں، یہ لوگ معصوم ہیں

آصف: آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن میں جو ناول لکھ رہا ہوں اُس کی کہانی میرے ذہن کے کھلے ساگر میں ڈبکیاں لگا رہی ہے اُس کے کردار میرے آس پاس اُچھل پھل مچا رہے ہیں اس لئے ضروری نہیں کہ میں سالہا سال انتظار کروں۔

نجمہ: لیکن

آصف: ہم لکھنے والے جب لوگوں سے ملتے ہیں تو ہم اُن سے وہی کچھ حاصل کرتے ہیں جو ہمارے کرداروں کو عظمت اور ہماری کہانی کو جلا بخشے۔ ہر آدمی جب بولتا ہے تو کچھ باتیں اُس کے ذہن سے اترتی ہیں اور کچھ دل سے اُبھرتی ہیں، ذہن کی باتیں ہمارے کام آتی ہیں

نجمہ: اور دل

آصف: دل سے جو باتیں اُبھرتی ہیں وہ جذباتی ہوتی ہیں

نجمہ: کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زندگی میں جذبات کا کوئی دخل نہیں، نہیں صاحب، زندگی میں جذبات نہ ہوں تو وہ بے سُر ہو کر رہ جائے گی، بے رس، بے مقصد، بے معنیٰ

آصف: معاف کیجئے آپ اِس وقت جو باتیں کر رہی ہیں وہ آپ کے دل کی باتیں ہیں، ذہن کی باتیں آپ پہلے کر رہی تھیں

کمال: آصف، میری بہن ایک پڑھی لکھی گڑیا ہے تم اسے باتوں میں نہیں جیت سکتے۔

(تیز موسیقی اُبھرتی ہے)

------وقفہ------

نجمہ: (اوراق اُلٹتے ہوئے) باب نمبر ۴..... ہر باب اپنی جگہ مکمل ہے..... دیکھتے ہیں کہ اس باب کے شروعات کہاں سے ہوتی ہے..... اور صدیوں پہلے جو عظیم (آصف کی آواز میں) جو عظیم شخصیتیں دنیا میں آئیں انہوں نے زمانے کے تلخ و ترش کو چکھا، گرم و سرد کو سہا، بے پناہ محبتیں کیں، سچائی کے لئے اپنی جانیں تک دینے سے گریز نہیں کیا اور دنیا چھوڑنے سے قبل اپنی دانائی، فن اور تخلیقی صلاحیتیں ہمیں دے گئے لیکن ہم نے اُن سے کیا حاصل کیا، یونہی محروم

اور بے ثمر رہے، اندر ہی اندر کھو کھلے ہوتے چلے گئے ۔۔۔۔ (نجمہ کی آواز) خلا، مایوسی اور تنہائی کے سناٹوں کے سوا کچھ نہیں ملا ۔۔۔ (وقفہ) ۔۔۔

۔۔۔۔موسیقی کی ایک ہلکی سی لہر۔۔۔۔

نجمہ: اس باب میں انہوں نے زندگی کی کتنی بڑی صداقت کو چند جملوں میں قلم بند کیا ہے۔

۔۔۔۔تیز موسیقی۔۔۔۔۔

(گولی چلنے کی آواز ابھرتی ہے)

کمال: میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ وہ دیکھو آکاش کی بلندیوں میں اُڑتے ہوئے پنچھی کو کیسے گرا دیا....

نجمہ: بھیا آپ کو ان معصوم پرندوں پر رحم نہیں آتا۔ دیکھے وہ پنچھی کیسے تڑپ رہا ہے۔ تڑپ تڑپ کا جان دے رہا..

کمال: جو بے رحم ہوتے ہیں وہ ہمیشہ کسی کی تڑپ سے بے آشنا ہوتے ہیں

آصف: جیسے تم..... یہی کہنا چاہتے ہو نا..... ذرا اپنی بندوق مجھے دینا

کمال: (ہنستے ہوئے) بندوق اور تم.... تم تو قلم چلاتے ہو، بندوق چلانا تیرے بس کی بات نہیں۔

نجمہ: دے دیجئے نا بھیا

کمال: تم سفارش کرتی ہو تو دیئے دیتا ہوں، پر سنبھال کر رکھنا۔

۔۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔

کمال: اب کیا سوچ رہے ہو، بندوق تمہارے ہاتھ میں ہے....

آصف: سوچ رہا ہوں تمہارے بندوق اور میرے قلم میں کتنا بڑا فاصلہ ہے، تمہارا کام ہے زندگی لینا اور میرا کام ہے زندگی کی حفاظت کرنا۔ میں اپنے قلم کی سیاہی سے لوگوں کو زندہ رہنے کی تحریک دیتا ہوں اور تم..... تم اپنے بندوق کی گولیوں سے معصوموں کے سینے چھلنی کر دیتے ہو، اُن کے سپنوں کو مسمار کر دیتے ہو۔ میں اپنے قلم سے امن و آشتی کا درس دیتا ہوں، پیار و

محبت کی قندیلیں روشن کرتا ہوں اور تم... تم اُس روشنی کو بجھا دیتے ہو، اُس وقت میں چیخنا چاہتا ہوں، چلانا چاہتا ہوں، میں رو بھی نہیں سکتا، آنسو بھی نہیں بہا سکتا۔

نجمہ: پھر وہی دل اور ذہن کی بات آپ کی نظروں کے سامنے آجاتی ہوگی.... آپ اپنی دل کی بات مان لیجئے نا پھر دیکھئے یہ زندگی کتنی شاداب ہوگی، آپ کو اپنے اردگرد پھیلی ہوئی بدصورتی میں بھی خوبصورتی نظر آئے گی۔

آصف: صرف نظر آنے لگے گی نا۔ لیکن حقیقی معنوں میں بدصورتی، بدصورتی ہی رہے گی اسے خوبصورتی کا لباس پہنایا نہیں جاسکتا، رہی دل کی بات..... دل کی بات مان لی تو دھڑکین شاید رُک جائیں گی (اپنے آپ سے آہستہ) آج کل یہ کم بخت دل بھی جانے کیا چاہنے لگا ہے جانے کس سوچ، کس نقش اور کس خیال کو اُجاگر کرنے لگا ہے۔

نجمہ: آپ کچھ کہہ رہے ہیں

آصف: (گھبرا کر) میں (جلدی سے) نہیں تو..... کمال صاحب، یہ لیجئے اپنی بندوق....

-------تیز موسیقی---------

-----(وقفہ)------

(اوراق الٹنے کی آوازیں اُبھرتی ہیں)

نجمہ: ناول کا یک اور باب..... ایک اور حصہ (پڑھنے لگتی ہے) میں نے اپنی روح.... (آصف کی آواز) میں نے اپنی روح سے کہا، ٹھہر اور اُمید کے بغیر انتظار کر کیونکہ اُمید غلط چیز کی ہوگی، محبت کے بغیر انتظار کر کیونکہ محبت غلط چیز کی محبت ہوگی، ابھی یقین باقی ہے مگر یقین، محبت اور اُمید سب زندگی کے غلام ہیں اور زندگی ---- زندگی وقت کے دربار کی انارکلی، ناچنے والی، بال روم میں، نیم عریاں ٹانگوں کا ناچ دیپک ناچ، عالم بالا میں روحوں کا ناچ اور وقت (نجمہ کی آواز میں) اور وقت جو تباہ کرتا ہے، وقت جو حفاظت کرتا ہے۔

------فیڈ اوٹ----

(ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے)

نجمہ: آپ سچ کہتے ہیں نا۔۔۔یہ افسانوی باتیں تو نہیں

آصف: سچ کہہ رہا ہوں۔۔۔ویسے میرے افسانوی کردار بھی زمین کی کھردری سطح سے ہی اُبھرتے ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے تم میرے سامنے کھڑی ہو۔۔۔آج مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے دل کی جھیل خشک ہو چکی تھی، خوابوں کا کنول مرجھا چکا تھا۔

نجمہ: اور اب

آصف: اب، جیسے آرزوں کا کنول کھل اٹھا ہے جو اپنی آغوش میں محبت کے موتی لایا ہے

نجمہ: میں۔۔۔میں آپ کو چاہتی ہوں

آصف: اور میں بھی

نجمہ: تو آج آپ دل کے ہاتھوں مجبور ہو ہی گئے

آصف: آخر بیچارہ دل ہی تو ہے

(۔۔۔۔۔دونوں ہنستے ہیں)۔۔۔۔

۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔

آصف: ارے تم یہاں ہو

نجمہ: ہاں تو

آصف: میں تمھیں کہاں کہاں تلاش کرتا رہا

نجمہ: کاش آپ نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا ہوتا

آصف: (ہنستے ہوئے) آخر میرے دل پر تمھیں اعتبار کیوں نہیں

نجمہ: اس لئے کہ آپ دل سے زیادہ ذہن کی باتوں پر یقین رکھتے ہیں

آصف: ہاں رکھتا ہوں (ہنستا ہے) لیکن ناول لکھتے وقت

نجمہ: اور محبت کرتے وقت

آصف: دل ذہن پر حاوی ہو جاتا ہے۔۔۔ لیکن تم یہ کیا بنا رہی ہو

نجمہ: (ہنستے ہوئے) میں.... میں تو اپنا گھر بنا رہی ہوں

آصف: مٹی کا گھر

نجمہ: ہاں تو.... کیا مجھے اُس گھر کا تصور کرنے کا کوئی حق نہیں جو میرا ہو

آصف: لیکن تمہارے پاس اتنی بڑی کوٹھی ہے۔۔۔ کیا وہ تمہارا گھر نہیں

نجمہ: وہ گھر (آہستہ سے) نہیں وہ میرا گھر نہیں، عورت کا گھر وہ ہوتا ہے، جہاں اُس کا پیار ہو، اُس کے بچے ہوں.... وہ گھر.... وہ گھر میرا کیسے ہو سکتا ہے جہاں آپ نہیں

۔۔۔۔ہلکی ہلکی موسیقی اور فیڈ اوٹ۔۔۔۔۔۔

------Change over ------

(نجمہ کی سسکیوں کی آوازیں اُبھرتی ہیں)

نجمہ: (روتے ہوئے اپنے آپ سے) مجھے یاد آ رہا ہے، سب کچھ یاد آ رہا ہے.... ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی، جانے یہ کس لمحے کی کہانی ہے، جانے کس صبح کی کہانی ہے، کس رات کا ذکر ہے، کبھی کبھی ایک لمحہ ایک رات میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ایک رات ایک صدی.... ایک یگ.... کاش وہ لمحہ کبھی نہ آیا ہوتا..... وہ صبح کبھی نمودار نہ ہوتی، وہ رات کبھی نہ جاگتی..... لیکن وہ لمحہ جنم لے چکا تھا، وہ لمحہ بے حد اندھیرا تھا، وہ صبح بڑی منحوس تھی.....

(ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)

اور اُس کے فوراً بعد گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور دور سے شور وغل اُبھرتا ہے۔۔ اور پھر یکدم سناٹا چھا جاتا ہے۔۔۔)

نجمہ: (اپنے آپ سے) وادیوں کی اِن خاموشیوں میں ایک عجیب سے ماحول نے جنم لیا۔ آکاش کی نیلی گہری وسعتوں میں کالی کالی گھٹائیں پھیل گئیں، دھوئیں کے کشفِ بادل اُٹھ اُٹھ کر بکھر گئے اور ہر سمت گولیاں چلنے کی آوازیں بکھر گئیں، میرے بھائی کمال کے پاس معصوم

سے پرندوں کو شکار کرنے کے لئے جو بندوق تھی وہ ضبط کر لی گئی۔۔۔۔میرے بھائی کے بدلے آصف کو پکڑ کر لے گئے شاید اس لئے کہ وہ اس شہر میں اجنبی تھا، ہم لوگ چیختے چلاتے رہے کہ یہ بندوق ہماری ہے، ہمارے پاس اِس کے کاغذات ہیں، آصف ہمارا مہمان ہے ہمارا دوست ہے لیکن ہماری بات کسی نے نہیں سنی ...... وہ ایک ناول نگار سے کچھ اور بن گیا یا بنایا گیا۔۔۔۔ہاں ایک ملی ٹنٹ .... ؟!

۔۔۔۔۔تیز موسیقی کی لہر۔۔۔۔۔۔

آصف: نجمہ میں جا رہا ہوں، شاید ہی اب کبھی ملنا ہو۔لیکن ....

نجمہ: لیکن کیا..... آپ رُک کیوں گئے... کہیے نا....

آصف: کبھی کبھی شام ہوتے ہی کالے سیاہ بادل پھٹ جاتے ہیں اور صاف وشفاف بارش برسنے لگتی ہے، مجھے یقین ہے کہ بہت جلد یہ کالے سیاہ بادل پگھل کر صاف وشفاف بارش کے روپ میں برسیں گے، ایک نیا سورج طلوع ہوگا۔۔۔ہو سکے تو میرا انتظار کرنا......... ؟!

۔۔۔۔۔موسیقی۔۔۔۔۔

(فیڈ اوٹ)

شازیہ: (دور سے) نجمہ .... (نزدیک آکر) میں نیچے کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں اور تم (ٹھہر کر) تم رو رہی تھیں کیا۔

نجمہ: (اُداس لہجے میں) نہیں تو؟

شازیہ: پھر تمہاری آنکھوں میں کیسے آنسو

نجمہ: یہ آنکھیں کبھی کبھی خود ہی ساون کی ندیاں بن جاتی ہیں شازیہ

شازیہ: نجو ڈیر میں سب کچھ سمجھ گئی

نجمہ: بھلا کیا

شازیہ: ہاتھ میں کتاب دیکھ کر... وہی ناول ہے نا، آصف کا لکھا ہوا ادھورا ناول۔۔"وادیاں خاموش

ہیں''۔اب یہ ناول شاید کبھی مکمل نہ ہوگا۔

نجمہ: تم ایسا کیوں سوچتی ہو شازیہ

شازیہ: اس لیئے کہ افسانہ اور ناول نگار جب زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو ٹھکرا کر خود ہی اپنی کہانیوں کے کردار بنتے ہیں، بے حس اور بے رنگ، یہ جب اپنے کرداروں کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں تو اُن کے لئے اپنے اردگرد کا ماحول بے معنیٰ ہو کے رہ جاتا ہے، یہ خود ہی اپنی کہانیاں لکھ کر اپنے آپ سے لپٹ لپٹ کر سو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ وقت کی دہلیز سے اُتر جاتے ہیں۔

نجمہ: نہیں شازیہ نہیں، یہ وقت کی دہلیز سے اُترتے نہیں بلکہ وقت کو اپنے ساتھ ملا کر اُس میں رنگ بھرتے ہیں، وہ ایک تلاش بن جاتے ہیں۔

شازیہ: یہ سب ناولوں کی باتیں ہیں۔

نجمہ: ایسا نہ کہو شازیہ

شازیہ: مجھے یقین ہے کہ تمہارے دل کا یہ زخم خود بخود مندمل ہو جائے گا۔

نجمہ: نہیں وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ یہ زخم اور بھی گہرا ہوگا۔

شازیہ: آج تمہارے چہرے پر یہ اُداسی دیکھ کر میں بہت خوش ہو رہی ہوں نجمہ۔

نجمہ: اُداسی اور خوشی، دو الگ الگ چیزیں ہیں شازیہ

شازیہ: ہاں جانتی ہوں لیکن اِس اُداسی میں جو اعتماد اور خلوص جھلک رہا ہے وہ زندہ رہنے کے لئے کافی ہے۔

-----قدموں کی چاپ اُبھرتی ہے-----

فرید: (دور سے) بی بی جی

نجمہ: کیا ہے فرید میاں

فرید: (نزدیک آکر) چھوٹے صاحب کا فون ہے۔

شازیہ: کمال گھر میں نہیں ہے فرید میاں

فرید: نہیں میم صاحب ۔۔۔باہر گئے ہیں

نجمہ: شازیہ میں ابھی آرہی ہوں۔

شازیہ: ٹھیک ہے۔

(قدموں کی آواز)

شازیہ: (اپنے آپ سے) جانے یہ سب کیا ہورہا ہے، کیوں ہورہا ہے، ہم تو پیار دامن کے پیغامبر تھے، ہمارے آدرش، ہمارے اصول ساری دنیا میں مقدس سمجھے جاتے تھے پھر یہ کیسی کالی گھٹا چھائی کہ برسنے کا نام تک نہیں لیتی ۔۔ اور وہ ناول نگار...... آصف نے کیا جرم کیا تھا.... شاید اُس کا جرم یہی ہے کہ وہ سچائی کا علم بردار ہے اور سچائی بڑی تلخ ہوتی ہے، اس کڑواہٹ کو برداشت کرنے کے لئے دل بھی چاہئے اور ذہن بھی ۔۔!

۔۔۔۔۔۔۔۔فیڈ اوٹ۔۔۔۔۔۔۔۔

کمال: نجمہ۔۔۔نجو

نجمہ: کچھ پتہ چلا بھیا، کب چھوڑ رہے ہیں آصف کو

کمال: ابھی نہیں... ابھی کیس کی hearing کچھ اور دن چلے گی..! I have full faith in judiciary یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ بندوق اُس کی نہیں بلکہ میری ہے، میں کورٹ میں لائینس پیش کر چکا ہوں، البتہ اب یہ ثابت کرنا ہے وہ کس مقصد سے اِن وادیوں میں آیا ہے۔

نجمہ: وہ تو اپنی کہانیوں کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔

کمال: اور اس کے لئے ثبوت.....

نجمہ: اُس کی تحریر کردہ کہانیاں..... اُس کا ادھورا ناول..... وادیاں خاموش ہیں

کمال: یہ کہانیاں بھی اُس کی رکاوٹ بنتی جارہی ہیں

نجمہ: کیا مطلب

کمال: آصف اپنی کہانیوں میں انسانی وقار اور اُس کی عظمت کی آواز بلند کرتا رہا ہے، ظلم، غربت، ناانصافی، پسماندگی اور جہالت کی نشاندہی کرتا رہا ہے، اُس سماج اور معاشرہ کو عریاں کرتا رہا ہے جہاں عزت محبت اور جُرت سونے کی عوض نیلام ہوتی ہے، وہ قتل و غارت، ناانصافی کے بارے میں لکھتا رہا ہے۔۔۔۔

نجمہ: یہ کوئی جرم تو نہیں.....

کمال: سچ بولنا ہی اُس کا سب سے بڑا جرم ہے۔۔۔ لیکن مجھے یقین ہے۔

نجمہ: کس بات کا

کمال: فیصلہ اُسی کے حق میں ہوگا.... سچائی جیت جائے گی

نجمہ: انشاءاللہ.....

۔۔۔۔۔فیڈ اوٹ۔۔۔۔۔

گھڑی کی ٹِک ٹِک سنائی دیتی ہے جو وقت گزرنے کے علامت کو ظاہر کرتی ہے۔۔

اور ٹِک ٹِک کے پس منظر میں ایک آواز اُبھرتی ہے۔

آواز: اَندھیرا.... اَندھیرا.... اور وقت بھاگتا رہا، نئی روشنی اور نئے اُجالے کی تلاش میں.... اور وہ تاریک لمحے فنا ہو گئے جنہوں نے اِس خوشحال دھرتی کا سکون اور قرار چھین لیا تھا، خون خرابہ کو جنم دیا تھا تہذیب و تمدن کو مسمار کیا تھا۔ اب ایک نیا سورج طلوع ہو رہا ہے سکون اور انسانی پیار و محبت کا سورج............

۔۔۔ ٹِک ٹِک کی آوازیں اور اُبھرتی ہیں اور پھر خاموش ہو جاتی ہیں۔۔۔۔

۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔

کمال: (دور سے) نجمہ کہاں ہو تم

نجمہ: کیا ہے بھیا

کمال: (نزدیک آکر) تمہارے چہرے پر یہ اُداسی.... اُداسی کا یہ نقاب پھینک دو.... مسرتوں اور خوشیوں کے لمحے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

نجمہ: بھیا

کمال: آصف قید کی چار دیواری سے آزاد ہو رہا ہے۔۔۔ وہ پھر آزاد فضاؤں میں اپنی کہانیوں کی تلاش میں آرہا ہے۔۔ آؤ آج دونوں مل کر اُس کا سواگت کریں....

نجمہ: (خوش ہو کر) بھیا یہ کوئی سپنا تو نہیں

کمال: نہیں نجمہ نہیں .... سپنا جاگنے سے پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے اور حقیقت اب ہمارے سامنے ہے۔

-----وقفہ-----

(گاڑی اسٹارٹ ہونے، چلنے اور پھر رُکنے کی آواز)

-----وقفہ----

آصف: یہ آپ کس روشنی کی بات کر رہے ہیں، کس اُجالے کی کہانی کو دہرا رہے ہیں (زور سے) کہاں ہے روشنی، کہاں ہے اُجالا.... ابھی تو ہر سمت تاریکی ہی تاریکی ہے (آہستہ سے) اندھیرے کا سورج ابھی تک غروب نہیں ہوا۔

کمال: نہیں میرے دوست، اندھیرے کا سورج کب کا غروب ہو چکا ہے، نور اور اُجالے کا سورج طلوع ہو چکا ہے۔ اب ہم پھر سے اپنی دھرتی کی آزاد فضاؤں میں گھوم پھر سکتے ہیں...... یہ نجمہ ہے۔

آصف: نجمہ.... کون نجمہ.... میں کسی نجمہ کو نہیں جانتا

کمال: آصف... تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ بُجھے بُجھے اور کھوئے کھوئے سے کیوں ہو میں تیرا دوست

ہوں، تمہارا ہم راز.... کیا دکھ ہے تجھے.... مجھے بتاؤ۔

آصف: بھلا مجھے کیا دُکھ ہو سکتا ہے... (آہستہ سے) دُکھ.... انسانی حسرتیں پائمال کی گئیں، خوف وہراس اور دہشت کا ماحول قائم کیا گیا، انسانی وقار کو سر بازار نیلام کیا گیا، زباں بندی کردی گئی، قلم کی آزادی چھین لی گئی اور یہ آدمی کہتا ہے کہ مجھے کیا دُکھ ہے (ہنستا ہے) ہاں مجھے کیا دُکھ ہو سکتا ہے۔

نجمہ: سُنیے

آصف: کون.... کون ہیں آپ

نجمہ: میں نجمہ ہوں.... نجو

آصف: (زور سے) میں..... میں کسی نجمہ کو نہیں جانتا

نجمہ: آپ.... آپ بہت تھک چکے ہیں شاید

آصف: ہاں میں شاید بہت تھک چکا ہوں۔

نجمہ: آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔آپ چلئے نا

آصف: کہاں چلوں...... یہاں تو ہر طرف نوک دار کانٹے بچھے ہیں، ہر سمت گھٹن ہے۔

کمال: نہیں آصف، تم جس گھٹن کی بات کررہے ہو وہ گھٹن ختم ہو چکی ہے۔

آصف: اگر واقعی وہ گھٹن ختم ہو چکی ہے تو میرے سینے پر یہ کیسا بوجھ ہے، میرے ذہن کی پگڈنڈی پر یہ کیسی دُھول ہے، میرے آنکھوں کے سامنے یہ کون سا کالا دیو آناً فاناً کھڑا ہوا جاتا ہے۔

نجمہ: (روتے ہوئے) بھیا، انھیں لے چلئے.... یہاں سے لے چلئے

آصف: سنو بھائی، یہ عورت رو کیوں رہی ہے.... میری طرح دُکھی ہے کیا

نجمہ: ہاں میں دُکھی ہوں، بہت دُکھی

آصف: کیا دُکھ ہے آپ کو

نجمہ: کاش میں اپنا دُکھ ظاہر کرسکتی.... کاش (رونے لگتی ہے)

آصف: رومت، یہ آنسو بے حد قیمتی ہیں، کاش اِس عورت نے وہ آنسو دیکھے ہوتے جو اس دھرتی نے بہائے ہیں، اپنے آدرشوں کے تحفظ کے لئے.... یہ دھرتی (ٹھہر ٹھہر کر) ہماری وشال دھرتی ہماری ماں ہے نا۔۔ ماں اپنی گود کی ویرانی نہیں دیکھ سکتی۔

۔۔۔۔۔۔۔۔فیڈ اوٹ۔۔۔۔۔۔۔

(پس منظر میں ہلکی ہلکی موسیقی)

آصف: آپ اس مٹی سے کھیل کیوں رہی ہیں۔

نجمہ: میں کھیل نہیں رہی ہوں، گھر بنا رہی ہوں

آصف: گھر..... آپ گھر بنا رہی ہیں۔

نجمہ: کیا مجھے اپنا گھر بنانے کا کوئی ادھیکار نہیں

آصف: یہ گھر بن بھی گیا تو کیا ہوگا

نجمہ: اس گھر میں، میں رہوں گا ہم دونوں رہیں گے

آصف: ہش... ایسی باتیں نہیں کرتے.... وہ کالا دیو پھر آجائے گا اس گھر کو مسمار کر دے گا، خوابوں کو نوچ لے گا، پھولوں کی رنگت چُرا کر انھیں بے رنگ کر دے گا۔

۔۔۔(پس منظر میں پھر ہلکی ہلکی موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)۔۔۔

نجمہ: دیکھئے مجھے آپ سے شکایت ہے۔

آصف: کیسی شکایت

نجمہ: آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ وہ ادھورا ناول مکمل کریں گے

آصف: کون سا ناول.... کیسا ادھورا پن

نجمہ: وادیاں خاموش ہیں، آپ کا ناول جو اس لئے مکمل ہوتے ہوتے رہ گیا کہ آپ

آصف: (بات کاٹ کر) مجھے گرفتار کر لیا گیا..... یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ

نجمہ: ہاں

آصف: کل رات میں دیر تک سوچتا رہا کہ کہاں سے شروع کروں، بے شمار سوچیں میرے ذہن کے سمندر میں اُمڈ آئیں لیکن مجھے لگا کہ میرے قلم کی سیاہی خشک ہو چکی ہے۔ کاغذ کے بکھرے اوراق میرے سامنے پھڑ پھڑانے لگے تو مجھے یوں لگا جیسے میری فکر کے پرندے ذہن کی طویل راہوں میں بٹھک گئے ہوں۔۔۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے میرا ماضی میرے سامنے کھڑا ہو گیا.....

نجمہ: ماضی.... آپ کا ماضی تو بہت ہی شاندار ہے، آپ کی تخلیقات کو آپ کے پڑھنے والوں نے پسند کیا ہے، سراہا ہے۔

آصف: کاش میرا ماضی میری تحریروں میں پوشیدہ ہوتا..... میرا ماضی تو میرے لوگوں کے دُکھ سُکھ میں بکھرا ہوا ہے، اُن کی خوشی میری خوشی ہے، اُن کا دُکھ میرا دکھ

نجمہ: یہ دُکھ سُکھ آپ تب ہی بانٹ سکتے ہیں جب آپ اپنے قلم کو جنبش دیں گے، آپ کے سینے کے اندر چھپے ہوئے آتش فشاں کو پھٹنے دیں گے۔

آصف: مجھے لگتا ہے جیسے ایک زلزلہ آنے والا ہے۔

نجمہ: زلزلہ، آج آپ زلزلوں سے ڈرتے ہیں، کبھی تو آپ خود زلزلہ تھے

۔۔۔۔۔وقفہ۔۔۔۔۔

(۔۔۔تیز تیز ہوائیں چلنے کی صدا۔۔۔ کھڑکیوں کے پٹ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔۔۔۔)

کمال: نجمہ کھڑکیاں بند کردو۔۔۔ تیز ہوا چل رہی ہے۔

۔۔۔۔(کھڑکیا بند کرنے کی آواز)۔۔۔۔۔۔

کمال: آصف کہاں ہے

نجمہ: وہ اپنے کمرے میں ہیں.....

کمال: میں نے ڈاکٹر وانی سے بات کی تھی

نجمہ: کیا کہا ڈاکٹر صاحب نے

کمال: اُن کی یہی رائے ہے کہ آصف ذہنی کرب میں مبتلا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی سوچوں کو قلم کا روپ دے۔

نجمہ: کوشش کو کر رہی ہوں بھیا

(دور سے کسی چیز کے گرنے اور شیشہ ٹوٹنے کی آواز ۔۔۔)

نجمہ: (گھبراتے ہوئے لہجے میں) شاید انہوں نے قدِ آدم آئینہ پر کوئی چیز پھینک دی۔

کمال: جلدی سے چلو....

.....وقفہ.....

آصف: (زور سے) میں نے اسے ختم کر دیا

کمال: کسی کی بات کر رہے ہو

آصف: اس قدِ آدم آئینے میں کوئی شخص گھور گھور کر میری طرف دیکھ رہا تھا میرا مذاق اُڑا رہا تھا۔۔ مجھے لگا جیسے پرانے وقتوں کا وہ رس بھرا لمحہ اجنبی راہوں سے ٹکرا کر میرے وجود کے اندھے نگر میں ایک پُل بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔۔۔ دیکھو اب وہاں کچھ بھی نہیں۔کوئی بھی نہیں

کمال: (زور سے) آصف

آصف: صرف ایک خلاء

نجمہ: انھیں سنبھالئے بھیا..... میں ڈاکٹر وانی کو یہاں آنے کے لئے فون کرتی ہوں۔۔

(فون ڈائیل کرنے کے تاثرات اور فیڈ آوٹ)

(پس منظر میں بارش برسنے کے تاثرات)

نجمہ: میں نے کہا تھا نا شازیہ وہ اپنے کمرے میں ہی ہوں گے....... دیکھئے شازیہ آپ سے ملنے آئی ہے۔

شازیہ: آداب

آصف: کیسی ہیں آپ

شازیہ: شکریہ.... اب آپ کی طبیت کیسی ہے۔

آصف: میری طبیعت کو ہو کیا گیا تھا۔ اچھا بھلا تو ہوں۔

نجمہ: کل بخار ہوا تھا نا آپ کو، اسی لئے پوچھ رہی ہیں۔

آصف: ہاں بخار تو ہوا تھا

شازیہ: بہت دنوں سے آپ کی کوئی تحریر نظروں سے گذری نہیں

آصف: کچھ لکھا ہی نہیں

شازیہ: نہ لکھنے کی کوئی وجہ تو ہوگی

آصف: میں خود بھی نہیں جانتا اور آپ (روز سے) آپ کچھ اور جاننا چاہتی ہیں۔

شازیہ: جی... میں.... میں

آصف: میں باہر جا رہا ہوں... بارش ہو رہی ہے نا، بارش میں بھیگنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے، بارش برستی ہے تو کائینات کا رنگ نکھر جاتا ہے، ہر شئے دُھل جاتی ہے۔

نجمہ: بارش میں بھیگنا آپ کی صحت کے لئے ٹھیک نہیں، آپ کو تکلیف ہوگی۔

آصف: آپ میری تکلیف کا بہت خیال رکھتی ہیں، کیوں، کس لئے؟

نجمہ: (رونے کے انداز میں) میں آپ کو چاہتی ہوں، بہت پیار کرتی ہوں آپ سے، مجھ سے آپ کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔

آصف: میری حالت.... لیکن اُس وقت یہ آنسو کہاں تھے جب..... میں..... میں جا رہا ہوں۔

نجمہ: رُک جائے گا..... سُنیئے تو سہی

(آصف کے جانے کے تاثرات)

شازیہ: حوصلہ رکھو میری اچھی بہن

نجمہ: یہ سب کیا ہو رہا ہے شازیہ .....

شازیہ: ڈاکٹری مشورہ..... ڈاکٹر کیا کہتے ہیں

نجمہ: ڈاکٹر وانی ہر دوسرے تیسرے دن دیکھنے آتے ہیں۔

شازیہ: لگتا ہے حراست کے دوراں انھیں بے حد اذیت ناک لمحوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

نجمہ: ڈاکٹر وانی بھی یہی کہہ رہے تھے۔

----وقفہ----(فیڈ اوٹ)

-----ٹِک ٹِک کی آواز اُبھرتی ہے۔

نجمہ: (سرگوشی کے عالم میں) بھیا

کمال: کیا ہے

نجمہ: (آہستہ سے) آہستہ بولیئے

کمال: (آہستہ سے) کیا ہے نجمہ

نجمہ: وہ دیکھئے پردے کے اس پار ....وہ سامنے والی کھڑکی سے....

کمال: یہ تو آصف ہے، یونہی بے مقصد کمرے میں گھوم رہا ہے، طبیعت ٹھیک ہے نا اِس کی۔

نجمہ: آپ ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پا رہے ہیں، میرے قریب آیئے نا.....ہاں....وہ دیکھئے انہوں نے اپنے ادھورے ناول کو سامنے رکھا ہے، کاغذ بھی پڑے ہیں، قلم بھی ہے وہ لکھنا چاہتے ہیں، مجھے لگتا ہے کہ اُن کے ذہن کی راہوں پر پڑی دُھند آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی ہے، وہ پھر اپنی کہانیوں کی دنیا میں لوٹ رہے ہیں۔

کمال: پھر یہ ہچکچاہٹ کیوں

نجمہ: بس ایک risk لے رہی ہوں بھیا

کمال: کیسا risk---what do you mean----میں.....میں

نجمہ: آپ دیکھئے تو سہی

----وقفہ----

کمال: یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے

نجمہ: یہ اُن کی لکھی ہوئی ایک پرانی کہانی ہے۔ ایک زخم اور سہی.... مین اس کہانی سے چند جملے پڑھتی ہوں، شاید ایسا کرنے سے اُن کے خیالات کا طویل سلسلہ جڑ جائے گا۔۔۔ (زور سے پڑھنے لگتی ہے) اِن سب چہروں کا سیلاب میرے اپنے چہرے میں جانے کہاں چُھپ گیا ہے، میں تو ہر چہرے میں اپنے چہرے کو تلاش کرتا ہوں مگر ہر چہرے پر اجنبیت کا خول چڑھا ہوا ہے۔۔اور ہر چہرہ مجھ پر ہنستا ہے۔۔وقت کا درپن تو میرے چہرے سے اُجلا ہے ان سب چہروں سے اُجلا ہے، مگر میرا چہرہ تو میرا چہرہ ہے۔

کمال: (آہستہ سے) خاموش ہو جاؤ

نجمہ: بھیا

کمال: وہ دیکھو....اب یہاں سے چلتے ہیں

نجمہ: چلئے بھیا

---وقفہ---

(-----صبح کا وقت، پرندوں کی چہچاہٹ اور دور سے اللہ اکبر کی صدا گونجتی ہے---!)

آصف: (زور سے) کوئی ہے۔ نجمہ... نجمہ کہاں ہو تم

نجمہ: بھیا (خوش ہو کر) بھیا وہ مجھے بُلا رہے ہیں

آصف: نجمہ

کمال: جاؤ..... نجمہ جاؤ.....

---وقفہ---

نجمہ: آپ..... آپ

آصف: ہاں میں ہوں۔ پہچان رہی ہو نا

نجمہ: آپ

آصف: مجھے یوں گھور گھور کر نہ دیکھو... میں آصف ہوں... تمہارا ناول نگار... تم مجھے چاہتی ہو نا

نجمہ: (روتے ہوئے) ہاں، چاہتی ہوں، بہت پیار کرتی ہوں

آصف: تو پھر یہ آنسو کیوں۔

نجمہ: یہ آنسو میری محبت کے راز دار ہیں، اس لئے بن پوچھے ہی اُمڈتے چلے آرہے ہیں۔

آصف: میں نے.... میں نے وہ ادھورا ناول مکمل کرلیا ہے۔۔۔وہی ناول جو تمہیں بے حد پسند ہے۔ ہاں ہاں ''وادیاں خاموش ہیں''

نجمہ: بھیا آپ کہاں ہیں، انہوں نے پھر سے لکھنا شروع کر دیا ہے۔۔۔وہ ادھورا ناول بھی مکمل کرلیا ہے۔

آصف: کائینات کی ہر شئے حرکت میں ہے، ایک جاتی ہے اور دوسری آتی ہے، پرانے رشتے ٹوٹتے ہیں اور نئے تعلقات جنم لیتے ہیں۔ نظریات اور خیالات بدل جاتے ہیں۔۔۔سر بلند طاقتیں فنا ہو جاتی ہیں اور نئی تخلیقی قوتیں وجود میں آتی ہیں۔

نجمہ: آصف

آصف: آؤ، پیڑوں کے اِن سرخ پیلے پتوں پر اپنا نام لکھ کر بین کرتی ہوئی ہواؤں کے ساتھ کہیں دور چلیں.... بہت دور....

کمال: (دور سے) کہاں ہے میرا دوست، میرا یار...... میرا ناول نگار

آصف: میں یہاں ہوں ..... آجاؤ میرے بھائی، میرے دوست......وادیاں ایک بار پھر خاموش ہوگئی ہیں....

کمال: (نزدیک آکر)۔۔ ہاں میرے دوست، وادیاں واقعی خاموش ہوگئی ہیں، اب آکاش کی وسعتوں میں اُڑتا ہوا کوئی بھی پنچھی بندوق کی گولی کا شکار نہیں ہوگا....

(موسیقی اور فیڈ اوٹ)

☆☆☆☆☆

تاثرات

نورشاہ اپنی تخلیقات کے پس منظر میں......

کشمیر کے افسانہ نگاروں جنہیں افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک خصوصیت حاصل ہوگئی ہے نور شاہ بہت نمایاں ہیں، ادب اور افسانہ نگاری کا شوق اُنھیں بچپن سے ہی رہا، نورشاہ کو کہانیاں لکھنے کا نہ صرف ذوق ہے بلکہ سلیقہ اور اچھا سلیقہ ہے، انہوں نے سنیکڑوں کردار پیدا کئے اس عہد کے افسانہ نگاروں کی طرح اُنھیں بھی مظلوم اور مفلوک انسانوں سے ہمدردی ہے، کشمیری عوام کی زندگی، اُن کے جذبات، اُن کے رنج وغم، مسرتوں تمناؤں اور خواہشات کے کتنے ہی مرقعے اِن کے افسانوں میں ملتے ہیں، فرائڈ کے جنسی نظریئے سے وہ متاثر ہیں اور جنسی جذبات کو پیش کرنے میں اُنھیں دلچسپی ہوتی ہے تاہم وہ کُھل کر کہنے سے ہچکچاتے ہیں اس لئے اُنھیں اکثر بیاں کے پیچ وخم کی راہ اختیار کرنا پڑتی ہے، نورشاہ کو کہانی لکھنے پر اتنی دسترس حاصل ہوگئی ہے کہ وہ تکنیک بدل بدل کر لکھتے ہیں!

پروفیسر عبدالقادر سروری

نورشاہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہے کہ افسانے ذہن میں نہیں بلکہ زندگی کی کھردری سطح پر بکھرے پڑے ہیں، اِن کو سلیقے سے چننا اور صناعی سے واقعات اور محسوسات کو ایک قصے کی صورت میں پیش کرنا نورشاہ کو خوب آتا ہے۔

علی جواد زیدی

نورشاہ کی تحریروں میں زخم خوردہ دلوں کی دھڑکیں ملتی ہیں، انداز بیاں میں جو شگفتگی رچاو اور موسیقی ہے وہ تو کچھ حیات پرور پہاڑی وادیوں کی عظمت وجلال کی دین ہیں اور کچھ اپنے ماحول اور طبقے کی رہین منت۔ نورشاہ بطور کہانی کار مقبول ومعروف ہیں، نورشاہ کی تحریروں میں شعور وفکر کی اکثر مثالیں ملتی ہیں زبان اور اسلوب فنکارانہ اور شاعرانہ ہے۔

اعجاز صدیقی

- آپ افسانے خوب لکھتے ہیں، کیا اچھا ہو کہ آپ اپنی محنت اِسی صنف پر صرف کریں۔

پروفیسر شمس الرحمان فاروقی

- نورشاہ کی کہانیوں میں ایک ایسی افسانویت ہے جو آج کل کے افسانوں میں مشکل سے ہی ملتی ہے، افسانویت کے علاوہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ زبان کی سلاست ہے اور وہ انداز بیان جو افسانوں کے لئے موزوں ہے۔

راما نند ساگر

- نورشاہ ایک تخلیقی فنکار ہیں اُن کے افسانے موضوع اور تکنیک کی ہم آہنگی کی وجہ سے قاری کے احساس اور جذبے کو فوراً ہی چھو لیتے ہیں، اُن کی رومانیت، ماحول اور فطرت کے باطن میں اُتر جاتی ہے اور پھر کرداروں کے احساس اور جذبے تک پہنچ جاتی ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن

- نورشاہ کی کہانیاں جہاں انسانی زندگی کے نشیب وفراز کا آئینہ ہیں وہاں اِن میں زندگی کی ہولناکیوں اور مسرت آفرینوں کی جھلک بھی نمایاں ہے۔

ٹھاکر پونچھی

- نورشاہ اُردو کے چابکدست، پختہ مشق اور صف اول کے افسانہ نگار ہیں، اُن کے افسانوں کا موضوع زندگی آمیز اور زندگی آموز ہوتے ہیں اور اُن کا بیانیہ بہت رواں رواں، مشکل الفاظ کے بوجھل پتھروں سے آزاد اور جاذب نظر ہوتا ہے۔

محمد یوسف ٹینگ

- رومان سے حقیقت تک کے سفر میں نورشاہ کا تخلیقی برتاؤ ریاست میں اُردو افسانے کو ہئیتی اور موضوعاتی سطح پر کئی نوح کے تجربات سے آشنا کرتا ہے اور اُردو افسانے کے مجموعی / عالمی سرمائے میں یہاں کے خارجی اور داخلی منظر کے حوالے سے ایک انفراد عطا کرتا ہے۔

پروفیسر مجید مضمر

- نورشاہ کی کہانیاں اُس کے اندر پوشیدہ کہانی کار کی جمالیاتی حِس کو بڑے پُر اثر انداز سے اُجاگر کرتی ہیں۔

کیول سوری

- نورشاہ کی کہانیوں کو جیسے جیسے پڑھتے تو محسوس ہوتا ہے کہ اِن کے ہاں ورائٹی ہے وہ اگرچہ کثرت سے لکھتے ہیں لیکن خود کو دہراتے ہوئے محسوس نہیں ہوتے، ابھی اِن کے قلم میں تازگی ہے۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی

- ہر تخلیق میں فنکار کا دل دھڑکتا ہے اس کی اپنی سانسیں ہوتی ہیں، اُس کے اپنے احساسات و جذبات اور جب تخلیق مکمل ہو جاتی ہے تو لوگ اِسے اپنے ہی احساسات کا آئینہ کہنے لگتے ہیں اس سے فنکار کی کامیابی کا ثبوت ملتا ہے اور اس کے فن کی ایک نئی سمت معین ہونے لگتی ہے، نورشاہ کے قلم سے نکلے ہوئے جواہر پارے دیکھ کر میں نے محسوس کیا ہے کہ اُن کا فن دریا کے ایک نئے دھارے کی طرح اپنا راستہ خود بناتا ہوا دھیرے دھیرے اُس سمندر کی جانب بڑھ رہا ہے جسے ''ادب'' کہتے ہیں۔ رام لعل

- نورشاہ کی اپنی زندگی اُس کے چہرے کے خدوخال کی طرح ہموار رہی ہے لیکن اُس کی تخلیقات میں بڑے نشیب و فراز ہیں وہ خود شاید جن حالات، ذہنی کیفیات اور انسانی نفسیات کی بھول بھلیوں سے نہیں گذرا اُن سے اپنے کرداروں کو دوچار کر کے معیاری ادب کی تخلیق کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے، آغاز خوب سے اور انجام خوب تر ہونے کی بہت سی توقعات۔ علی محمد لون

- کشمیر کو دنیا کی جنت کہا گیا ہے، جنت کا احساس کرتے وقت ہم اپنے آپ کو ایک خوبصورت ترین دنیا میں پاتے ہیں، نورشاہ کا تعلق کشمیر سے ہے، اس لئے انہوں نے اپنی کہانیوں میں ایک جنت کا احساس دلایا ہے، نورشاہ کی کہانیوں میں ہمیں جمالیاتی احساس کی بلندیاں ملتی ہیں، انہوں نے اپنی کہانیوں میں جس خوبصورتی سے قدرت کے رنگوں کی آمیزش کر کے حسین اور شاہکار تصویریوں کی تخلیق کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی اِس کی کہانیوں میں ایک طرف چنار کے وقار، ڈل کی خاموشی اور وادی کی وسعت ہے تو دوسری طرف انہوں نے بڑی مہارت سے جذبات کی عکاسی بھی کی ہے، کہانیوں اور افسانوں کی دنیا میں لوگ اپنا

مقام بناتے ہیں مگر نور شاہ نے اپنے طرز بیاں اور انداز تحریر سے ایک نئی دنیا بنائی ہے اور یہ دنیا...... بے شک جنت سے کم نہیں۔

چاندنی

تمہاری کھڑکی سے جتنا آسمان نظر آرہا ہے اُس میں تمہارے کردار کی روشنی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے، تم بنیادی طور پر کس قدر حساس ہو یہ صاف نظر آرہا ہے اور جو کچھ تمہارے آس پاس ہورہا ہے تمہاری نظروں سے بچ نہیں پایا، اچھی باتوں کی پزیرائی اور بے انصافی کے خلاف احتجاج بھی ہے۔

ویدراہی

نور شاہ بنیادی طور پر شاعرانہ ذہن رکھتے ہیں، اُن کا اسلوب بھی شاعرانہ ہے جس سے اُن کی کہانیوں میں قوس وقزح کے رنگ آگئے ہیں اور اسِی خصوصیت نے نور شاہ کے افسانوں کو ایک انفرادیت بخش دی ہے لیکن اسِ کے ساتھ ہی نور شاہ افسانہ بُننے کے گُر سے بھی واقف ہیں وہ انسانی زندگی کی مجبوریوں اور ناکامیوں کی کہانیاں لکھتے ہیں، انسانی نفسیات کا مطالعہ نور شاہ کی کہانیوں میں صاف نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی

اگر چہ نور شاہ کی بیشتر کہانیوں کے پلاٹ اور اُن کے کردار رومانی فضا میں سانس لیتے ہیں لیکن زندگی کی تلخ وشیرین سچائیاں بھی اُن کے افسانوں میں موجود ہیں۔

اسد رضا

جموں و کشمیر کے اُردو افسانہ نگار کے عنواں سے بہت عرصہ کے بعد کشمیر سے ایک ایسی کتاب منظر عام پر آئی ہے جس کا ادبی حلقوں کو شدت سے انتظار تھا ایسا نہیں ہے کہ اس سے قبل اس موضوع پر کتابیں نہیں لکھی گئیں مگر اس تصنیف کی خاصیت یہ ہے کہ یہ ایسے قلم کار نے قلم بند کی ہے جو گذشتہ پچاس سال سے قلم کا سپاہی رہا ہے، اس نے قلم کاروں کے کارواں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، نئی ادبی تنظیموں کو بنتے بگڑتے دیکھا ہے، کئی ادبی تحریکوں کو اُبھرتے اور دم توڑتے دیکھا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ہمیشہ ادب کا سنجیدہ قاری اور طالب علم رہا ہے۔

دیپک بدکی

- نورشاہ اُردو کے موجودہ منظرنامے پر گہرے مشاہدات اور پُر اسلوب بیان کے بل بوتے پر توانا اور زندگی آمیز تخلیقات پیش کرنے والوں میں اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں وہ جس طرح اپنے افسانوں میں تسلسل اور ترتیب کا خیال رکھتے ہیں اُسی طرح شگفتگیٔ بیان کا بھی بھرپور اہتمام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فرید پربتی
- نورشاہ کی کہانیاں دراصل کشمیر کی کہانیاں ہیں جن میں نہ صرف یہاں کا حسن اور خوبصورتی اُمڈ آئی ہے بلکہ انہوں نے جس خوبصورتی کے ساتھ یہاں کے عوام کے رستے ہوئے درد کا مداوا کیا ہے اُس کی داد نہ دنیا کورذوقی ہوگی۔ ڈاکٹر پریمی رومانی
- نورشاہ کی کہانیوں میں شگفتگی ہے انداز میں شائستگی ہے، تحریریں زندگی سے روشن ہیں، مجروح دلوں کی دھڑکنیں ہیں، موسیقی کا رچاؤ ہے، چنچل ندیوں کا بہاؤ ہے، چنار کا جگمگاتا شباب ہے، ڈل کا خاموش اضطراب ہے، وادی کی وسعت بیکراں ہے، محرومیاں ہیں، مجبوریاں ہیں، نزدیکیاں ہیں، دوریاں ہیں، کیفیتوں کی مچلتی کہکشاں ہے، نورشاہ کشمیر شناس ہیں، زندگی کے عکاسی ہیں اور اُن کا فن کشمیر کی طرح شاداب ہے۔ پروفیسر ظفر احمد نظامی
- نورشاہ ہمارے سینئیر افسانہ نگار ہیں' اُن کے افسانے قاری کو متوجہ کرتے ہیں' یہ اُن کے اسلوب نگارش کی پختگی کی دلیل ہے۔ سلام بن رزاق
- نورشاہ نے کشمیر میں ادب کے لئے بہت اچھا کام کیا ہے بلکہ تمام برصغیر کے سامنے ایک کامیاب تصویر پیش کی ہے۔ ڈاکٹر اقبال مہدی
- بند کمرے کی کھڑکی میرے لئے ایک دلچسپ تجربے سے کم نہیں خصوصاً اس لئے کہ اِس میں وادی کا حسین ماضی قدم قدم پر جھانکتا ہے۔ جاوید رحمانی
- نورشاہ کم از کم الفاظ میں اپنا مدعا و مقصد پیش کرنے میں قدرت رکھتے ہیں۔

عمر مجید

کوئی بھی قلم کار اپنے گرد نواح کے حالات، واقعات اور حادثات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا ہے اور پھر جب حالات و حادثات کی شدت ایسی ہو کہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ یا کسی شعبے سے وابستہ کوئی بھی فرد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تو قلم کار کا قلم حالات و واقعات کے گرد ہی گھومتا ہے حالانکہ نور شاہ کی افسانوی دنیا کا محور چند خاص موضوعات ہی رہے ہیں لیکن اس حقیقت کے باوجود پچھلی دو دہائیوں کے پُر آشوب حالات نور شاہ کی نظروں سے اُوجھل نہیں رہے، رہتے بھی کیسے نہ جانے اِن ایام میں نور شاہ خود کتنے مراحل سے گذرے ہوں گے اور کتنے حادثات و واقعات کے چشم دید گواہ بنے ہوں گے نہ جانے کتنے لوگ 'اپنے پرائے' نور شاہ کی ذہنی اور قلمی حس کو چھو کر بگڑے حالات کا بلواسطہ یا بلا واسطہ شکار بنے ہوں گے' ایسے میں نور شاہ جیسے افسانہ نگار کے لئے حالات سے لاتعلق رہنا کیسے ممکن ہوتا' اُن کا پچاس برسوں کا ساتھی قلم اُن کے خیالات' جذبات اور احساسات کا کیسے ساتھ نہ دیتا؟! کشمیر کہانی نور شاہ کے اُن افسانوں اور ڈراموں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے گذشتہ بیس بائیس برسوں کے دوراں موجودہ حالات و واقعات کے تعلق سے قلم بند کئے، مجھے یقین ہے کہ علم و ادب اور افسانوں و کہانیوں میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مجموعہ غیر معمولی دلچسپی کا باعث ہوگا!!

جاوید ماٹجی

سرینگر مارچ ۲۰۱۲ء

☆☆☆☆☆



نور شاہ کی تخلیقات

